تہذیب
اور اُس کے
ہیجانات

سگمنڈ فرائڈ

ترجمہ
احمد سعید

اردو مرکز

تہذیب

اور اس کے

ہیجانات

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❣❣❣❣❣❣❣

تہذیب

اور اس کے

ہیجانات

(CIVILIZATION AND ITS DISCONTENTS,)

از

سگمنڈ فرائڈ ایم۔ ڈی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی

مترجم
احمد سعید ایم اے صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات لیکچرار انگریزی
دیال سنگھ کالج، لاہور

اُردُو مرکز ○ لاہور

○ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

○ ناشر: ظہیر الدین احمد
○ طابع: نقوش پریس لاہور
○ پہلی بار ۱۹۵۹ء، تعداد ۱۰۰۰
○ قیمت دو روپے چار آنے

صدر دفتر
اُردو اکیڈمی سندھ
رحمت بلڈنگ نزد مسافر خانہ
کراچی

پیش لفظ

(مترجم)

فطرت میں یوں تو کئی انقلاب آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ زمین چاند، سورج، ستارے، پہاڑ دریا، وادیاں اور صحرا انھیں کی پیداوار ہیں لیکن ان سب سے بڑا انقلاب انسان کے تہذیب و تمدن کی سیڑھی پر قدم رکھنے سے آیا۔ اس کا مقصد اس کی زندگی میں نظام پیدا کرنا، اُس کے جینے کے لئے ایک خاص سلیقہ وضع کرنا اور اُس کی عائد کردہ پابندیوں کے ماتحت اپنی خواہشات پورا کرنا تھا۔ بایں ہمہ انسان اس منزل پر یک دم، ایک ہی جست میں نہیں پہنچا۔ داستانِ تہذیب وغیرہ سے تو اب تک یہی ثابت ہوا ہے کہ انسان نے لکھوکھا برس کے بعد دائرہ تہذیب میں قدم رکھا۔ اُسے جہاں فطرت کی تباہ کاریوں سے بچنے اور ان پر قابو پانے کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں اس سے بھی زیادہ خطرات اور ہولناکیوں سے محفوظ رہنے کا مسئلہ بھی درپیش

آیا۔۔۔۔ یہ اس کی اپنی فطرت تھی !۔ اس کا اپنا ناقابل فہم ذہن !!

شروع میں وہ اسے نہ صرف مافوق الفطرت بلکہ نیک اور بد طاقتوں کا مسکن گردانتا تھا۔ ان کی ماہیت جاننے کے لیئے اس کا شعور اور تجسس جوں جوں بڑھتا گیا۔ تہذیب سے پیدا شدہ مسائل بھی اس کے ساتھ زیادہ پیچیدہ اور لاینحل ہوتے چلے گئے۔ بالفاظ دیگر، گوکہ اس نے اپنی فطری وحشت اور خواہشات پر جتنی زیادہ پابندیاں لگائیں وہ زیادہ ہولناک صورتیں اختیار کرتی چلی گئیں۔ گناہ کا تصور انہیں سے پیدا ہوا اور ایک آہنی پھندے کی مانند اس کے گلے کے گرد زیادہ سختی سے لپٹتا چلا گیا۔۔۔۔ باغ بہشت سے نکلنے کے بعد اور روئے زمین پر اس جرم کی سزا مہذب انسان کی صورت میں زندگی بسر کرنے سے عبارت ہے شجر ممنوع کا پھل کھانے یعنی ممنوعہ جنسی خواہش کو پورا کرنے کی پاداش ! وہ جتنا مہذب ہوتا چلا گیا جنسی خواہشات کو اتنی ہی سختی سے دباتا چلا گیا نتیجتاً اس کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ تہذیب نے جہاں اس کی زندگی کو حسن اور جلا بخشی، اس میں مقابلتاً ٹھراؤ پیدا کیا، اس کے لئے آرام و آسائش اور زینت کے ذرائع مہیا کیے، وہاں اس کی ذہنی الجھنوں میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس کی جڑ اس کی فطری خواہشات کو پورا کرنے کی خواہش تھی جن میں جنسی خواہش نمایاں ترین تھی۔۔۔ غلیظ اور ناپاک ! سائنسی تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خواہش انسان کے نزدیک معتوب ترین ہے، گو کہ سب سے زیادہ طاقتور۔ یہ ایک ایسا آتش فشاں مادہ ہے جو نکاس کا راستہ نہ پانے کی صورت میں خوفناک نتائج پیدا کرتا ہے

ماہرین جنسیات، علم الانسان، بالخصوص تجزیہ نفس، نے اس امر کو ناقابلِ تردید پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ جبلت جنسی کا نہ صرف حیوانات میں بلکہ انسان میں بھی سب سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ تجزیہ نفس کے یکتا طریقے اور اس کے ذریعہ حاصل کردہ مصدقہ مشاہدات اور تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ انسانی ذہن کا تین چوتھائی حصہ لاشعور رہتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی صلاحیتوں، آرزوؤں اور محرومیوں کے نقوش کا گہوارہ ہوتا ہے یعنی کہ عام عقیدے کے برعکس مجموعی طور پر، انسان اپنے صحیح محرکات سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے نتائج سے باخبر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان مہیب اور تباہ کن دشمنوں اور ان کی آپس میں جنگوں سے بھی بے خبر ہوتا ہے جو وہ اس کے ذہن کی تاریک گہرائیوں میں، لاشعور کے جنگل میں لڑتے ہیں اور ان کے نتیجے میں نہ صرف فرد بلکہ اس کے معاشرے میں خلفشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان تمام گناہوں اور جرائم اور جنگ و جدال کے مترادف ہیں جنھیں تہذیب جنم دیتی ہے اور جن کی روک تھام کے لئے وہ مختلف حربے اختیار کرتی ہے۔

لیکن ایسی دریافت کوپرنیش اور ڈارون کی دریافتوں سے کہیں زیادہ انقلاب انگیز ثابت ہوئی۔ اول الذکر نے یہ ثابت کر کے انسان کی "خود پسندانہ سادہ لوحی" کو پہلا دھچکا لگایا کہ یہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ اس کے ایک ذرے سے بھی کمتر حیثیت رکھتی ہے یعنی کہ کائنات میں انسان کا مقام صحرا کے ذرے کا سا ہے۔ علاوہ ازیں، انسان کے اپنے بارے میں ایسے نظریے

کو ایک اور دھچکا لگا کہ وہ فقط عمل ارتقا کا معراج ہے۔ بندر اور بن مانس کی اولاد ہے۔ صرف ترقی یافتہ ادراک ہی اسے دوسرے جانوروں سے ممیز کرتا ہے لیکن اس سے پیدا شدہ خود پسندی اور تعلی کو سب سے بڑا دھچکا تجزیۂ نفس نے پہنچایا، اس دریافت سے کہ لاشعوری اعمال کے مقابلے میں عقل و خرد اور شعور کا بہت کم حصہ ہوتا ہے ورنہ اس کے عقائد اور عمل میں ناقابل عبور بُعد نہ پایا جاتا۔ کیا وجہ ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے اور زندگی کو بہتر بنانے کے درخشاں اصول وضع کرنے اور تابندہ نصب العین رکھنے کے باوجود ہمیشہ بدی کی طرف راغب رہا ہے، اخوت انسانی کا متمنی، امن کا متلاشی، مساوات کا نام لیوا، اخلاقی اقدار اور زیادہ تر مذہب کا علمبردار ہونے کے باوجود بربریت، تباہ کاری، کشت و خون، ناانصافی، استحصال پسندی، حق تلفی، ہوس پرستی میں شیطان کو بھی مات کر جاتا ہے حتیٰ کہ بیسویں صدی کے اس دور میں وہ بنی نوع انسان کی کلی تباہی کی طرف تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے۔۔۔۔ ایٹم اور ہائیڈروجن اور دیگر قیامت خیز جنگی ساز و سامان ایجاد کر کے!

سگمنڈ فرائڈ، تجزیۂ نفس کا بانی اور نفسیات کے عظیم ترین ماہر ہے۔ وہ سائنسی اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے ذریعہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تہذیب کے ہیجانات کی سب سے بڑی وجہ لاشعور کی سحر طرازیاں، مغلوب جنسی خواہشات اور غیر صحت مندانہ اخلاقی اور سماجی نظاموں کی پیداوار ہیں۔ یاد رہے کہ وہ جنس کو اپنے محدود معنوں میں نہیں لیتا جس میں عام لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ زیر نظر

کتاب اس کی سائنسی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اس نے تجزیہ نفس کو فقط فرد واحد کی ذہنی بیماریوں کے علاج کے لیے ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسان کے ان بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے جو اسے تہذیب کے میدان میں پہلا قدم رکھنے کے بعد پیش آئے۔ گو یہ کتاب (اس کا اصلی جرمن ایڈیشن) آج سے تقریباً اڑتیس برس قبل شائع ہوئی لیکن آج اس کے مصنف، -فرائڈ- کا "تہذیب کے ہیجانات" کا نظریہ اور بھی زیادہ عمیق، ناقابل تردید قابل غور اور عملی دکھائی دیتا ہے۔

یہ ترجمہ کس حد تک کامیاب ہے، اس کا اندازہ صرف قاری ہی لگا سکتا ہے۔ مجھے ماہر مترجم ہونے کا قطعاً کوئی دعویٰ نہیں۔ تجزیہ نفس کا ایک مخلص طالب علم ہونے اور نفسیات کی درس و تدریس کے معاملے میں کئی برسوں سے مشغولیت کے باعث اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت تجزیہ نفس اور الفاظ کی روح تک پہنچنے کی ضرور کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب "پیشہ ور نفسیات، بالخصوص تجزیہ نفس سے غیر متعلق مترجموں کے ترجموں سے ضرور مختلف ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ میں نے اصل کی روانی، فرائڈ کی تحریر کے رنگ فقروں کی بندش اور اتار چڑھاؤ (جسے مقلد مترجم کے لئے کئی جگہ غیر اصولی اور پریشان کن انحراف سمجھا جائے گا) کو ترجمہ کرتے وقت پیش نظر رکھا ہے۔ ایسا اعتراض جرمن سے انگریزی کے ترجمے پر بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ کئی جگہ فقرے الجھے ہوئے، پیچیدہ سے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ان سے پیدا شدہ

حسن، زور اور ابلاغ کو کم نہیں کرتا۔

آخر میں مجھے اُردو مرکز، بالخصوص جناب ظہیر الدین صاحب کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اس کتاب کی افادیت کو اس کے کاروباری پہلو پر ترجیح دے کر شائع کیا ہے۔

١

ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ انسان غلط معیار قائم کرتا ہے، ہر شخص طاقت، کامیابی اور دولت حاصل کرنے کا متلاشی ہوتا ہے اور ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو یہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صحیح معنوں میں زندگی کی بیش بہا چیزوں کی پوری قدر نہیں کرتا۔ تاہم اس قسم کا کوئی قطعی فیصلہ دیتے وقت انسان کو اس بات کا خدشہ لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں انسانیت کی انواع و اقسام اور اس کی ذہنی زندگی کو نہ بھول جائے۔ چند ایک ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی اُن کے ہمعصروں کو عزت کرنا پڑتی ہے حالانکہ ان کی بلندی ان خصائل اور کارناموں پر مبنی ہوتی ہے جن کا عوام الناس کے اغراض و مقاصد سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ آنے کو تو انسان کے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی آسکتا ہے کہ آخر کار ان نامور ہستیوں کی محدود تعداد بھی

قدر و منزلت کرتی ہے لیکن عام لوگ ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بایں ہمہ لوگوں کی رائے اور حرکات میں اتنی بے ربطی ہوتی ہے اور ان کی خواہشات کے اتنے پہلو نظر آجاتے ہیں کہ حقیقت اتنی سادہ معلوم نہیں دیتی جتنی وہ دکھائی دیتی ہے۔

اس قسم کے غیر معمولی انسانوں میں سے ایک شخص نے مجھے جو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں مجھے اپنا دوست کہہ کر پکارا ہے۔ میں نے اسے ایک چھوٹی سی کتاب بھیجی تھی جس میں میں نے مذہب کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ فقط ایک التباس ہے۔ صاحب متذکرہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ مذہب کے متعلق میرے نظریے سے بالکل متفق ہے لیکن اُسے اس بات کا افسوس تھا کہ میں نے مذہبی جذبات کے آخری سرچشمے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ ایک ایسے عجیب احساس کی پیداوار ہے جس سے وہ اب تک چھٹکارا نہیں پا سکا۔ بہت سے اور لوگ اس کے ہم خیال ہیں اور شاید اس کا یہ خیال ہے کہ لاکھوں کو اس قسم کا تجربہ بھی ہوتا ہے جسے موصوف "ابدی حس" کا نام دینا پسند کرے گا۔ ایک "لامحدود"، "بیکراں" قسم کا احساس۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ خالص داخلی قسم کی کیفیت ہوتی ہے۔ جزوِ ایمان نہیں، انفرادی حیاتِ جاوداں کا ثبوت نہیں، بلکہ مذہبی احساس کا منبع ہے۔ مختلف مذاہب اور عقائد اسی کی پناہ لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں مختلف صورتیں دی جاتی ہیں اور طرح طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس احساس کی بنا پر آدمی اپنے آپ کو مذہبی کہنے میں حق بجانب ہے، خواہ وہ تمام عقائد اور فریبوں سے منکر کیوں نہ ہو۔ میرے

اس دوست کے نظریات، جس کی میں بہت عزت کرتا ہوں اور جس نے ایک مرتبہ مایا کے طلسم کو ایک نظم میں بیان کیا تھا، مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اپنے آپ میں "بیکراں" قسم کا احساس نہیں پاتا۔ احساسات کا سائنسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا آسان کام نہیں۔ ہم فقط اپنی جسمانی علامات بیان کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں جس صورت میں یہ ناممکن ہے۔ مجھے شک ہے کہ "احساس بیکراں" ایسا غیر مرئی قسم کا ہوتا ہے کہ اسے کسی درجہ بندی میں قید نہیں کیا جا سکتا اور اس کا حاصل ماسوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کہ آدمی اس کے خیالی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہو سکے جو آسانی اپنے آپ کو مذہبی احساس سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اگر میں اپنے دوست کو صحیح سمجھ سکا ہوں تو اس کا مطلب وہ تشفی ہے جو ایک جدت پسند اور انوکھے قسم کا مصنف اپنے اس ہیرو کو دے جو خودکشی کرنے کے متعلق سوچ رہا ہو۔ "ہم اس دنیا سے باہر تو گر نہیں سکتے"۔ چنانچہ یہ ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ مجموعی طور پر بیرونی دنیا کا ایک جزو لاینفک ہونے کا احساس بن کر رونما ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ بادی النظر میں اس قسم کی عقلی رائے زنی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ جذبات سے عاری نہیں ہوتی بلکہ کچھ اس قسم کی ہوتی ہے جو دوسرے انتہائی گہرے افکار کو بھی ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس قسم کے احساس کے بنیادی ہونے کو ماننے کے لئے تیار نہیں لیکن اس بنا پر میں اس بات سے منکر نہیں ہو سکتا کہ یہ فی الحقیقت لوگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ تو پھر آدمی یہ سوال پوچھتا ہے کہ آیا اسے صحیح سمجھا گیا ہے اور کیا اسے

مذہب کی ضرورت کے احساس کا سرچشمہ کہلانے کا حق پہنچتا ہے۔ میں اس بارے میں ایسی کوئی رائے پیش نہیں کرسکتا جس سے اس مسئلہ کو بخوبی حل کیا جاسکے۔ یہ خیال کہ انسان کو اپنے گردوپیش کی خبر احساس کے ذریعے ملتی ہے، جس کا شروع ہی سے یہ مقصد ہوتا ہے، اس کا ہمارے نفسیاتی نظریے کے ساتھ اتنا بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تجزیہ نفس کرنا، اس کا آغاز بیان کرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ اس قسم کے مندرجہ ذیل خیالات ذہن میں آجاتے ہیں۔ عموماً ہمیں اپنی شخصیت، اپنے انا کے علاوہ کسی چیز کا یقین ہونا۔ بادی النظر میں ہمیں یہ ہر اعتبار سے نہایت واضح، خود مختار، واحد قسم کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ اس امر کا صرف تجزیہ نفس کے ذریعہ ہی پہلی بار پتہ چلا ہے کہ یہ ظہور فریب دہ ہے۔ اس کے برعکس شعور اس کے اندر تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس کی واضح طور پر احاطہ بندی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اس کی حد ذہن کے ایک جدا حصہ "لاشعور" میں مدغم ہو جاتی ہے جسے ہم ID (جبلی سرچشمہ) کہتے ہیں اور جو اس کا صرف ایک رُخ ہوتا ہے۔ تجزیہ نفس کی مدد سے ہمیں ابھی انا اور جبلی سرچشمہ کے درمیان رشتے کی نوعیت کو دریافت کرنا ہے بہر نوع بیرونی دنیا کے سامنے انا اپنی شکل بالکل واضح اور صاف رکھتا ہے۔ صرف ایک حالت میں یہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ایک غیر معمولی کیفیت، سچ ہے، لیکن وہ ایسی نہیں جسے بیماری سے منسوب کیا جائے۔ جب محبت انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو انا اور محبوب کی حدود

معدوم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے تمام حواسِ خمسہ کے ثبوت کے برعکس گرفتارِ محبت یہی سمجھتا ہے کہ وہ اور اُس کا محبوب ایک ہیں اور وہ اس قسم کے عمل درحرکت کرتا ہے جیسے یہ ایک حقیقت ہو۔ وہ چیز جو کسی اعصابی کام سے معدوم ہو سکتی ہے اس میں کسی روگیلے عمل کی وجہ سے بھی گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔ علم الامراض کی رو سے ہمیں چند ایک اور ایسی کیفیتوں کا پتہ چلتا ہے جن میں شعور اور خارجی دنیا میں حد تفریق غیر یقینی ہو جاتی ہے یا جن میں فی الواقع غلط امتیاز کیا جاتا ہے۔ ایسی حالتیں جن میں انسان کے جسم کے اعضا، حتیٰ کہ اس کے ذہن کے حصے، احساسات، خیالات محسوسات اُسے بیگانے، اُس سے غیر متعلقہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی بیماریاں بھی معلوم کی گئی ہیں جن میں آدمی وہ سب کچھ، جو اُس کے اندر سے رونما ہوتا ہے بیرونی دنیا سے منسوب کرتا ہے، جسے اُسے خود پہچان لینا چاہیئے۔ چنانچہ انا کی خود آگاہی میں گڑبڑ پیدا ہو جانا لازمی ہے اور اس کے اور خارجی دنیا کے درمیان حد تفریق غیر مبدل ہے۔ اس پر زیادہ غور و خوض کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنے انا کے متعلق بالغ کا احساس ابتدا سے ایک ایسا نہیں رہتا۔ اس نے اپنی بالیدگی میں کچھ اس قسم کی ترقی کی ہو گی جو ثابت نہیں کی جا سکتی لیکن جس کا از سر نو تعمیر کرنا ممکن نہیں[1]۔ جب شیر خوار بچے کو پہلی بار چھاتی سے محرکات ملتے ہیں تو وہ اتنی تمیز نہیں کر سکتا کہ وہ اُس کے انا سے یا خارجی دنیا سے آتے ہیں۔

---

[1] اس موضوع پر فیرینزی کی STAGES IN THE DEVELOPMENT OF THE SENSE OF REALITY, 1913 - نامی تحقیقات سے شروع ہو کر فیڈرن کے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء تک اور اُس کے بعد ازاں جو تحقیقات ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اس سے مختلف حاجات کے تحت ہی رفتہ رفتہ اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے اس کے ذہن پر یقیناً اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ ہیجان کے بہت سے اسباب، جنھیں وہ بعد میں پہچان لے گا وہ یہ کہ اس کے اپنے ہی جسمانی اعضا ہیں، کسی وقت اُس کی حسیات کے باعث بن سکتے ہیں لیکن دوسرے عارضی طور پر اس کی گرفت سے نکل جاتے ہیں ــــ ان میں سے جن کا وہ سب سے زیادہ متلاشی ہوتا ہے پستانِ مادر ہوتے ہیں۔ مدد کے لئے آہ و پکار پر وہ دوبارہ رونما ہوتے ہیں۔ پہلے پہل ہر شے آدمی کو یوں معلوم ہوتی ہے جیسے وہ خارجی ہو، جو محض ایک مخصوص عمل کی پیداوار ہوتی ہے۔ انا کی تشکیل اور بالیدگی کے لیے وہ اکثر ناقابلِ گریز اور متعدد دکھ درد اور ناخوش گوار محسوسات فراہم کرتی ہے۔ یہ قانونِ حقیقت کاری (REALITY PRNICIPLE) کے لامحدود تسلط کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے نیست و نابود کر دیا جائے یا اس سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ یہ محسوسات کا گھٹا ہونے سے بھی قدرے مختلف صورت رکھتا ہے، یعنی خارجی دنیا کو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح اَنا کو ہر اس شے سے علیحدہ کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، جو باعث تکلیف بن سکتا ہے علاوہ ازیں اسے بے دخل کر کے اس کے بجائے عیش کوش انا (PLEASURE-EGO) کا قائم کرنا۔ غیر ذاتی، پر خطر خارجی دنیا سے مختلف ہوتا ہے۔ اس قدیم عیش پرست اَنا کی حدود میں تجربات کے مطابق تبدیلی آنا ناقابلِ گریز ہے۔ وہ فرحت بخش تجربات جنھیں آدمی برقرار رکھنا چاہتا ہے اُس کے اَنا کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے اسباب کے۔ اور وہ چیز جو اس کے لئے

باعثِ اذیت ہوتی ہے اس کی انا کا جزوِ لاینفک ثابت ہوتی ہے۔ اس کا سرچشمہ داخلی ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا طریقہ سیکھتا ہے جس سے وہ عمداً پٹھوں کو استعمال کرتا ہے اور حواس خمسہ کو حرکت میں لاتا ہے جن کے بموجب وہ داخلی اور خارجی دنیا میں تمیز کر سکتا ہے — انا کا کون سا حصہ ہے اور خارجی دنیا کی کیا پیداوار ہے — اور اس طرح وہ قانونِ حقیقت کاری سے متعارف ہونے کی طرف پہلا قدم اٹھاتا ہے۔ اس کے زیرِ اثر اس کی آئندہ نشو و نما ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جو کچھ سیکھتا ہے اس میں قوتِ امتیاز عملاً فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اسے ان حسیات سے جو تکلیف دہ ہوں یا خطرہ کا باعث ہوں بچنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اندرونِ انا سے پیدا شدہ پُر درد ہیجانات سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے انا وہی ذریعہ کام میں لاتا ہے جو وہ خارجی دنیا سے پیدا شدہ تکالیف سے بچنے کے لئے استعمال کرتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام روگیلی (MORBID) تکالیف کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس طرح انا اپنے آپ کو بیرونی دنیا سے الگ کر لیتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ دراصل انا ہر چیز کا حامل ہوتا ہے۔ بعد ازاں یہ بیرونی دنیا کو اپنے آپ سے علیحدہ کر لیتا ہے۔ وہ احساسِ انا جس سے ہم آگاہ ہوتے ہیں، اس کے مطابق، عہدِ گذشتہ میں کسی وسیع احساس کا سمٹا ہوا نشان دکھائی دیتا ہے — ایک ایسا احساس، جو ہمہ گیر تھا اور انا کا خارجی دنیا سے نہ ٹوٹنے والا رشتہ ظاہر کرتا ہے — اگر ہم یہ خیال کریں کہ انا کا یہ بنیادی احساسِ خود آگاہی بہت سے

لوگوں کے اذہان میں تھوڑی یا کافی حد تک محفوظ رہا ہے۔ وہ محدود تر اور واضح تر انا کے احساسِ بلوغت کے ساتھ تقریباً ایک جوڑ کی حیثیت میں موجود ہوگی۔ اور اُس کا خیالی مافیہ وسعتِ بیکراں اور دنیا سے ہم آہنگی کا خیال کہ وسعتِ بیکراں اور کائنات دراصل ایک ہی چیز ہیں ـــــ وہی احساس جسے دوست متذکرہ نے "بیکراں" کا نام دیا ہے۔ لیکن کیا ہمیں یہ بات فرض کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ اصلی قسم کا احساس اپنی بعد ازاں پیداوار کے ساتھ ساتھ زندہ رہتا ہے۔ بے شک۔ یہ منظر کوئی غیر معمولی نہیں ہے، خواہ یہ نفسیاتی یا کسی دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے یا جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے، ہمارا یہ نظریہ ہے کہ مدارجِ ارتقا میں پیچیدہ ترین چیزیں حقیر ترین کی وجہ سے بھی معرضِ وجود میں آسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم سادہ اشکال کو اب تک زندہ پاتے ہیں SAUSICUS عظیم نے مفقود ہو کر MAMMALS کو اپنی جگہ دے دی ہے لیکن ان کا مخصوص نمائندہ گھڑیال ORWDILE آج کل بھی ہمارے درمیان زندہ پایا جاتا ہے۔ شاید ایسا معلوم ہو کہ یہ تشبیہ زبردستی ٹھونسی گئی ہے اور یہ حقیقت اس کی شدت کو کم کر دیتی ہے کہ کمتر قسم کے حیوانات اصولاً موجودہ زیادہ ترقی یافتہ اصناف کے اصل اجداد میں ہیں۔ درمیانی درجہ کی بیشتر نسلیں تو ختم ہو گئی ہیں، جس کا ان کے از سرِ نو تعمیر کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس عالمِ ذہن اپنی صوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جو اس میں پیدا ہوئی ہیں، اپنی قدیم ترین شکل کو محفوظ رکھتا ہے اس حد تک کہ اس کا ثبوت بہم پہنچانا فضول سی بات معلوم ہوتی ہے

یہ عمل ارتقا کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی خاص ہیج یا خیال کی مقدار کا پہلو ویسے کا ویسا بچا رہتا ہے لیکن دوسرے پہلو میں مزید تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

یہ نکتہ ہمیں ذہنی مواد کے محفوظ کرنے کے عام مسئلہ کے زیادہ قریب لے آتا ہے جس پر شاذونادر بحث کی گئی ہے۔ بایں ہمہ یہ اتنا دلچسپ اور اہم ہے کہ یہاں ہمیں اس پر غور و خوض کے موقع ملنے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، گو یہاں اس کا براہِ راست کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت سے جب سے ہم نے یہ سمجھنا غلط تسلیم کر لیا ہے کہ عام قسم کی بھول قوت یادداشت کے دماغی نشانات کا منہدم ہونا یا ضائع ہونا ظاہر کرتی ہے۔ ہمارا نظریہ اس کے برعکس تبدیل ہوتا چلا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں بچی رہتی ہے اور خاص حالات میں اسے منظر عام پر لایا جا سکتا ہے مثلاً جب مراجعت (REGRESSION) نہایت گہری اور وسیع قسم کی ہو۔ اس نظریہ کا علم کے کسی اور شعبے سے مقابلہ کرنا معنی خیز اہمیت سے عاری نہ ہوگا۔ آیئے، ابدی شہر کو ہی مثال کے لئے منتخب کریں[لہ]۔ مورخ ہمیں بتاتے ہیں کہ قدیم ترین روم کا نام ROMA QUADRATA تھا۔ پیلیٹین پر ایک محصور نوآبادی واقع تھی۔ اس کے بعد سیپٹی مونیم کا دور دورہ شروع ہوا جب پہاڑی بستیاں متحد ہو گئیں۔ اس کے بعد وہ شہر جس کے اردگرد دیوار سرویَن کھڑی کر دی گئی تھی۔ ذرا آگے چل کر جب نظام جمہوری اور خاندان سیزر کے ابتدائی دور کی تبدیلیاں ختم ہو گئیں جب شہنشاہ اڈرین نے

[لہ] THE CAMBRIDGE ANCIENT HISTORY VOL.7. 1928
HUGH LAST از THE FOUNDING OF ROMA BY HUGH LAST

اس کا دیوار بنا کر احاطہ کر لیا۔ ہم ان مزید تبدیلیوں کا ذکر نہیں کریں گے۔ جو بعد ازاں اس شہر میں کی گئیں۔ بلکہ صرف یہ سوال پوچھیں گے کہ اس کو اپنی تاریخ میں جن ابتدائی مراحل سے گزرنا پڑا۔ ان کے اس سیاح کو کون سے نشانات ملتے ہیں۔ جو روم کو آج کل دیکھتا ہے۔ خواہ وہ تاریخی اور جائے وقوع سے متعلق تفصیلات اور علم سے لیس ہو کر کیوں نہ وہاں جائے۔ چند ایک شگافوں کو چھوڑ کر وہ دیوار آوڑلین کو ویسے کا ویسا پائے گا۔ اسے خندق سروین کے بھی کہیں کہیں ایسے حصے ملیں گے جہاں سے کھود کر اسے بے نقاب کیا گیا ہے۔ اگر اس کے بارے میں اس کے پاس خاص معلومات ہیں ـــــ موجودہ قدیم عمارات سے زیادہ ـــــ تو وہ اس شہر کی ساخت میں ساری دیوار اور ROMA QUADRATA کے خاکے کے آثاروں کا کھوج لگائے گا۔ اسے ان عمارات کا کوئی آثار ایک ٹکڑہ تک بھی نہیں ملے گا جو اس قدیم زمین کے حصے پر کبھی واقع تھیں۔ زیادہ سے زیادہ مستند معلومات حاصل کرنے کے باوجود اگر اس کے کچھ ہاتھ لگے گا تو وہ صرف ان معبدوں اور عوامی عمارات کی جائے وقوع بتانے کے قابل ہوگا جو اس زمانے میں یہاں قائم تھیں۔ ان جگہوں پر آپ کو آثار قدیمہ بھی ملتے ہیں لیکن یہ آثار ابتدائی عمارات کے نہیں بلکہ انہیں آگ لگائے جانے اور مسمار کر دینے کے بعد از سر نو تعمیر کرنے کے ہوں گے۔ اس بات کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ متذکرہ آثار ایک دار السلطنت عظیم کے ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ جو RENAISE NCE کے بعد استوار کیا گیا۔ بے شک بہت سا حصہ ایسا ہے۔ جو زمین کے نیچے، یا موجودہ عمارات کے نیچے دبا ہوا

ہے۔ اس طرح ہم روم جیسے تواریخی شہروں میں پرانے زمانے کی چیزیں اب تک محفوظ پاتے ہیں۔

آئیے' اب ہم ایک عجیب و غریب بات فرض کرلیں کہ روم انسانوں کی جائے رہائش نہیں ہے بلکہ ذہن کا ایک منفرد علاقہ ہے جس کی گذشتہ تاریخ اتنی ہی دیرینہ اور متنوع ہے جس میں ہر وہ چیز جو ایک بار بنائی گئی، فنا نہ ہوئی اور جس کے ارتقا کی پہلی منزل جدید ترین منازل کے ساتھ ساتھ بچی رہی۔ اس کا یہ مطلب یہ ہوا کہ روم میں محلات سیزر اب تک پیلیٹین پر کھڑے تھے اور سیپٹی زونیم سرویس' اب تک اپنی گذشتہ بلندیوں پر تھا اور خوبصورت مجسمے اب تک اپنی اپنی جگہ سینٹ اینجلو کے قلعے کے ستونوں کی قطاروں کے درمیان اس طرح لگے ہوئے ہیں جیسے وہ گاتھ کے محاصرہ کئے جانے سے پہلے تھے وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں جہاں PALEZZO CAFFRLLITE واقع ہے وہاں پھر سے اسے مٹائے بغیر، جو پیٹر کیپی ٹولین کا مندر اپنی جدید ترین صورت، بلکہ جیسے وہ سیزر کے عہد میں رومن لوگوں کو دکھائی دیتا ہے، اپنی اول ترین صورت میں، جب ای ٹرس کن کے نشان کا حامل تھا اور ٹیرا کوٹا اینٹی فکسے سے آراستہ ہوا کرتا تھا، وہاں اب تک کھڑا پایا جائے گا۔ COLOSIUM کی موجودہ جگہ پر ہم بیک وقت نیرو کا سنہری مکان دیکھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں پانتھین کے PLAZZA میں ہمیں نہ صرف آج کل کا وہ پانتھین ملے گا جو ہمیں ہیڈرین سے ورثہ میں ملا ہے بلکہ اسی مقام پر اگریپا کی اصلی عمارت بھی۔ درحقیقت اسی زمین کے سینے پر سینٹ سوپرا مائی نروا کا کلیسا ہوتا ہوگا اور وہ پرانا مندر

جس پر یہ استوار کیا گیا تھا۔ لیکن ناظر کو صرف اپنی نگاہ کے مرکز کو تبدیل کرنا پڑے گا تاکہ وہ ایک نہ ایک منظر کا تصور آنکھوں کے سامنے لا سکے۔

اس قسم کے تصور کو طول دینے سے زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یا تو بعید القیاس ہوگا یا شاید بے ہودگی تک پہنچ جائے۔ اگر ہم تاریخی سلسلے کو مکانی کی صورت میں پیش کریں تو یہ صرف انھیں ایک دوسرے کے قریب قریب رکھنے سے حاصل ہو سکے گا۔ ایک جگہ میں دو چیزیں نہیں سما سکیں گی۔ ہماری کوشش بے سود کھیل دکھائی دیتی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی جواز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لئے ذہنی زندگی کے حیرت انگیز خصائل کو صورتِ باصرہ میں تبدیل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔

یہاں بہرحال ایک ایسا اعتراض پیدا ہوتا ہے جو قابل توجہ ہے۔ یہ ذہن کو ایک شہر کی گذشتہ کہانی سے مشابہت دینا ہے۔ ذہنی زندگی کے اعتبار سے ہماری یہ رائے کہ ہر گذشتہ چیز محفوظ رہتی ہے اس شرط پر ہی صحیح ثابت ہو سکتی ہے اگر ذہن کا عضو صحیح سالم رہتا ہے اور اس کی ترتیب کو صدمے (TRAUMA) یا سوزش سے کوئی ایذا نہیں پہنچتی۔ کسی شہر کی تاریخ میں اس قسم کے روگیلے اسباب، جو تباہ کن اثرات سے ملتے ہیں، کی کمی نہیں ہوتی، خواہ اس کا ماضی کتنا گوناگوں کیوں نہ ہو۔ اور اگر لندن کی طرح اس میں بھی لوٹ مار نہ مچی ہو۔ پرانے شہروں کا ماضی خواہ انتہائی پرامن کیوں نہ ہو۔ ان میں پرانی عمارات کو گرا کر نئی عمارات تعمیر کی جاتی ہیں۔ اس لئے شروع ہی سے میرا شہر کا ذہن جیسی چیز سے تشبیہ دینا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس (vivid) قسم کے موثر مقابلے کی کوشش کو ترک کرتے ہوئے ایک اور چیز، کسی حیوان یا انسان کے جسم کی طرف آخرکار ایک سادہ، قریبی تشبیہ کے لئے متوجہ ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی اس قسم کی دقت پیش آتی ہے۔ بالیدگی کی پہلی منازل کسی صورت میں اب تک موجود نہیں ہیں وہ اپنے مابعد نقوش میں تحلیل ہو جاتی ہیں جن کے لئے انھوں نے مواد مہیا کیا تھا۔ بالغ کے جسم میں قبل از پیدائش بچے (EMBRYO) کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عالمِ شباب کے بعد بچپن کا دماغی غدود (THYMUS GLAND) کی جگہ ایک خاص ریشہ (TISSUE) لے لیتا ہے لیکن فی نفسہ اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ میں کسی بالغ کی ریڑھ کی ہڈی میں طفلانہ ساخت کی ہڈی کے آثار دکھا سکتا ہوں لیکن موخرالذکر از خود کسی حالت میں نہیں رہتا۔ یہ لمبی اور موٹی ہو گئی حتیٰ کہ اپنی آخری صورت اختیار کر گئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تمام ابتدائی منازل کا اپنی مکمل تشکیل تک ساتھ ساتھ چلے آنا ذہنی دنیا ہی میں ممکن ہے اور اس قسم کے منظر کو صورتِ باصرہ دینا ہمارے لئے ناممکن ہے۔

شاید ہم اس قسم کا نتیجہ نکالنے میں زیادتی کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کی صداقت کا اعلان کرنے پر قناعت کرنی چاہئے کہ ہر گذشتہ ذہنی تجربہ محفوظ رہ سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ نیست نابود ہو جائے۔ اتنا تو ہمیشہ ممکن ہوتا ہے کہ ذہن کے بیشتر دیرینہ اور معدوم شدہ معمولی یا غیر معمولی حصے تو بحال نہیں کیا جا سکتا یا کسی طریقہ سے دوبارہ حرکت میں نہیں لایا جا سکتا یا کہ اس کا بچ نکلنا لازماً موافق حالات سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے لیکن

ہمیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ ہمیں صرف اس حد تک یقین ہو سکتا ہے کہ ماضی کا ذہن میں زندہ رہنا ایک غیر معمولی مظہر نہیں بلکہ قانونِ قدرت ہے۔

چنانچہ ہم یہ بات سراسر تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ مدت سے لوگوں میں 'احساسِ بیکراں' موجود ہوتا ہے اور ہم یہ نظریہ قائم کرنے کے حق میں ہیں کہ اس قسم کا احساس کا انا کے ابتدائی دور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ آگے چل کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس احساس کو مذہب کی ضرورت کا سبب بننے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اس قسم کا دعویٰ پُرزور معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی جذبہ تب ہی طاقت کا سرچشمہ بن سکتا ہے جب وہ بذاتِ خود کسی شدید ضرورت کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔

مجھے تو یہ بات ناقابلِ تردید معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کی ضرورت بچے کی بے بسی اور اس سے پیدا شدہ تحفظِ پدرانہ کی ضرورت محسوس کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ کیفیت نہ صرف بچپن ہی سے چلی آئی ہے بلکہ یہ خوف بھی ہمیشہ اسے برقرار رکھتا ہے کہ تقدیر کی برتر طاقت سے نامعلوم کیا آفت نازل ہو جائے۔ لہذا احساسِ بیکراں کا کردار اہم ترین نہیں ہے، جو میری رائے میں نرگسیت (خود پسندی) کو بحال کرنے کا متلاشی ہوتا ہے۔ جذبہ مذہب ہستی کا سراغ تو بچے کی بے بسی کی طرف رجوع کرنے پر اوائل عمر تک پھیلا ہوا مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شاید اس کی وجہ کوئی اور بھی ہو لیکن فی الحال یہ پوشیدہ ہے۔

میں یہ تصور کر سکتا ہوں کہ 'احساسِ بیکراں' کا بعد ازاں مذہب کے ساتھ

رشتہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کائنات سے احساس ہم آہنگی، جو اس کی خیالی بنیاد ہو مذہب کے اطمینان دلانے کی پہلی کوشش کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ یہ انا کے ان حقیقی خطرات سے منکر ہونے کا ایک طریقہ ہے۔ میں ایک بار پھر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی غیر مرئی مقادیر کا استعمال کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ میرے ایک دوست نے جس کے ناقابل تسکین سائنسی تجسس کی وجہ سے اس نے غیر معمولی تحقیقات کر کے علم کا ذخیرہ حاصل کر لیا ہے مجھے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ یوگی تارک الدنیا ہو کر اپنے جسم کے اعمال پر توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ سانس لینے کے انوکھے طریقے اختیار کرتے ہیں اور فی الحقیقت اپنے اندر اس قسم کی کیفیات اور منتشر احساسات پیدا کر لیتے ہیں، جو موصوف قدیم ترین گہری ذہنی حالتوں کی طرف مراجعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست نے تصوف کی جسمانی بنیاد دریافت کر لی ہو۔ یہاں پر ذہنی زندگی میں کئی مبہم تبدیلیوں، مثلاً وجد اور بے خودی کے ساتھ بھی اس کا رشتہ قائم کرنا پڑے گا۔ لیکن میرا شیلر جیسے غوطہ زن کے الفاظ میں یہ کہنے کو دل چاہتا ہے۔

"جو سرد کے اوپر گلابی رنگ کی روشنی میں سانس لیتا ہے وہ شاید خوش ہو۔"

۲

میں نے اپنی کتاب FUTURE OF AN ILLUSION میں مذہبی جذبات کے عمیق ترین سرچشموں کی بہ نسبت اس بارے میں عام نظریے پر زیادہ بحث کی ہے۔ وہ عقائد دین اور وعدوں کا سلسلہ جو ایک طرف تو دنیا کے معمے کو قابلِ رشک کمال سے حل کرتا ہے اور دوسری طرف اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ فکرمند رب العلمین اس کا دھیان رکھتا ہے۔ کہ اگر اس زندگی میں کوئی کمیاں رہ گئی ہوں تو وہ آئندہ اس کی تلافی کردے گا۔ معمولی آدمی کے خیال میں رب العلمین کی صورت ایک اعلیٰ المرتبت باپ سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ صرف اس قسم کا خدا ہی انسان کی اولاد کی ضروریات کو سمجھ سکتا ہے یا ان کے اظہارِ ندامت سے متاثر ہو سکتا ہے یا نرم پڑ سکتا ہے۔ یہ تمام قصہ طفلانہ قسم کا ہونے کی وجہ سے آتنا عیاں ہے

اور حقیقت سے اتنا غیر مربوط ہے کہ اس شخص کے لئے جو بنی نوع انسان کی دوستی کا دم بھرتا ہے یہ خیال کر کے دکھ پہنچتا ہے کہ کثیر التعداد فانی کبھی اس نظریہ سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ یہ معلوم کر کے شرم آتی ہے کہ وہ لوگ جو آج کل زندہ ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو یہ جانتے ہوئے کہ یہ مذہب قابل تسلیم نہیں ہے، ہر قدم ہمارے یوں بچانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے وہ پیچھے سے قابل رحم حملے کر رہے ہیں۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایماندار دل میں شمار کرے تاکہ وہ فلسفہ دانوں کو متنبہ کر سکے جو مذہب کے خدا کی بجائے ایک غیر ذاتی، غیر مرئی اور تصوری اصول تبدیل کر کے یہ کہتے ہیں کہ تم اس مولا، اپنے خدا کا نام بے سود نہیں لوگے۔ عہد گذشتہ کی کئی مشہور و معروف ہستیاں یہی کرتی تھیں۔ لیکن یہ ہمارے لئے کوئی جواز نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انھیں کیوں ایسا کرنا پڑا۔

اب ہم عام لوگوں اور ان کے مذہب کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ واحد مذہب جس کا یہ نام رکھا جا سکتا ہے ہمیں ہمارے بڑے اور دانا شاعروں میں سے ایک کے وہ الفاظ یاد آ گئے جن میں وہ مذہب کے آرٹ اور سائنس سے رشتہ کے متعلق اپنا نظریہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ یہ ہیں :۔

جس کے پاس سائنس اور آرٹ ہیں
اس کے پاس مذہب بھی ہے
جس کے پاس مذہب نہیں ہے اس کے پاس آرٹ بھی نہیں ہے
تو پھر اسے دیندا [illegible] آگے،

CTION

اس کے برعکس یہ الفاظ مذہب کا انسان کے دو عظیم ترین کارناموں سے مقابلہ کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ زندگی میں قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔ اگر ہم عام انسانوں کو بھی مذہب سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو واضح ہے کہ شاعر کی معتبر رائے ہمارے حق میں نہ ہوگی۔ ہم کسی خاص طریقے سے اُس کے الفاظ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کی زندگی جس سے ہم دو چار ہوتے ہیں مایوس کن ہوتی ہے اور ناممکن الگذار دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ ہم تسکین بخش خدا کے بغیر نہیں رہ سکتے جیسا کہ تھیوڈور فانٹین نے کہا ہے ہم معاون ذرائع کو بھی برطرف نہیں کرسکتے۔ ان میں سے شاید مندرجہ ذیل تین دلچسپیوں میں تبدیلی ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم مصائب کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی بجائے ایسے سامان تفریح طبع، جن سے یہ کم ہو جاتے ہیں، وہ منشی چیزیں ہیں، جو ہمیں ان سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی کوئی نہ کوئی چیز ضروری ہے۔ جب والیٹر CANDIDE کو آخری نصیحت سے ختم کرتا ہے کہ لوگوں کو اپنے باغوں کی نگہبانی کرنی چاہیئے تو اس سے اُس کا مقصد یہ ہے کہ دلچسپی کو دوسری طرف موڑا جائے۔ سائنسی کام اسی قسم کا انحراف ہے۔ دیگر سامانِ تفریحِ طبع کا نعم البدل، جیسا کہ آرٹ میں پایا جاتا ہے حقیقت کے سامنے فریب ہے۔ بایں ہمہ اسی کے باعث ذہن کے لئے یہ مسرت بخش ہوتا ہے، جس کی وجہ

---

[1] DIE FROMME HELENE میں ولیم بش عام الفاظ میں یہ کہتا ہے: "جس شخص کے تفکرات دامن گیر ہوتے ہیں اس کے پاس برانڈی بھی ہوتی ہے"

عالمِ تخیل کا وہ خاص مقام ہے جو اس نے اپنی ذہنی زندگی میں اپنے واسطے پیدا کر لیا ہے۔ منشی اشیا ہمارے جسم پر اثر انداز ہوئی ہیں اور اس کے کیمیائی پہلو کو تبدیل کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں مذہب کو اپنی مخصوص جگہ دینا آسان کام نہیں ہے اس لئے ہمیں اور آگے چلنا ہوگا۔ یہ سوال کہ زندگی کا مقصد کیا ہے، بار بار پوچھا گیا ہے اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ شاید اس کا اس قسم کا جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ کئی مفکروں نے یہ مزید کہا ہے کہ اگر ایسا دکھائی دے کہ زندگی بے مقصد ہے تو یہ تمام اہمیت کھو دے گی۔ لیکن اس قسم کی دھمکی سے تو تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس یوں معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس قسم کے سوالات کو رد کرنے کا انسان کو حق پہنچتا ہو۔ ورنہ ہمیں بنی نوع انسان کی برتری میں اعتقاد، جس کے دوسرے اسالیب اظہار سے ہم واقف ہیں، پہلے ماننا پڑے گا۔ اگر یہ باور کیا جائے کہ وہ اتفاقاً حیوانات اور انسان کے کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں تو وہ کبھی یہ سوال نہ پوچھتا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ لیکن یہ جواب بھی بجا نہیں ہے کیونکہ بہت سے جانور ایسے ہیں جو انسان کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے ــــ صرف ان کی اقسام بتانے اور ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے سوا ــــ بے شمار اقسام تو اتنی فائدہ مند بھی نہیں ہوتیں کیونکہ وہ انسان کے انھیں دیکھنے سے پیشتر ہی پیدا ہوتی ہیں، مرجاتی ہیں اور مفقود ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایک بار پھر مذہب ہی اس سوال کا جواب دینے کا اہل ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ مقصد حیات کے متعلق خیال مذہب کے سچے یا غلط

ہونے ہی پر موقوف ہے۔

اس لیئے ہم اس کم اہم سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں انسان کہ اپنی حرکات وسکنات سے اس کی زندگی کا کونسا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ وہ زندگی سے کس شئے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس سوال کے جواب پر شاید ہی شک گذرے —— وہ خوشی کا متلاشی ہے، وہ خوش ہونا اور خوش رہنا چاہتا ہے۔ اس کوشش کے دو پہلو ہیں۔ مثبت اور منفی۔ ایک طرف تو اس کا مقصد درد اور بے چینی کو دور کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف انتہائی لذت پرستی۔ اگر لفظ.. خوشی.. کے محدود معنی لیئے جائیں تو اس کا تعلق موخر الذکر سے ہے۔ چنانچہ انسانی حرکات منقسم ہو جاتی ہیں، اپنی منازل مقصود کے دو اطراف میں، جن کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو وہ یا تو بہت زیادہ یا شرکت بلا غیر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ ہمارے دیکھنے میں آیا ہے "صرف" قانون لذت پرستی (PLEASRE -PRINCIPLE) ہی زندگی کے مقصد کا لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ شروع سے یہ قانون ذہنی آلہ کے اعمال پر غالب رہتا ہے۔ اس کے کارگر ہونے پر تو کسی قسم کا شک نہیں۔ تاہم اس کا پروگرام تمام دنیا سے متصادم ہوتا ہے۔ جزو سے لے کر کل تک —— لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اسے حرکت میں نہیں لایا جا سکتا۔ چیزوں کی تمام ساخت اس کے مخالف ہے۔ منصوبہ "تخلیق" میں یہ نیت کہ انسان خوش رہے۔ شامل نہیں ہے، جسے ہم محدود ترین، الفاظ میں خوشی سے تعبیر کرتے ہیں وہ ان تشنہ کام خواہشات کی آسودگی سے حاصل کرتا ہے۔ بیشتر اوقات فوری۔

جو شدید ترین ہو جاتی ہیں اور اپنی نوعیت کی وجہ سے جو اطمینان صرف ایک ایک عارضی کیفیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب قانون لذت پرستی کی کوئی پسندیدہ حالت طویل ہو جاتی ہے تو یہ خفیف قسم کے اطمینان کا احساس پیدا کر دیتی ہے ہماری ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ ہم صرف تضاد سے لطف اندوز ہوتے ہیں فی نفسہ[1] حالات سے بہت ہی کم۔ لہذا ہمارے مسرت حاصل کرنے کے امکانات شروع ہی سے ہماری جسمانی ساخت کی وجہ سے محدود ہو جاتے ہیں۔ ناخوش ہونا اس سے بہت کم مشکل کام ہے۔ تکلیف تین اطراف سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے اپنے جسم سے، جس کا انجام تنزل اور تحلیل ہے، اور جو تفکر اور درد کو بطور علاماتِ خطرہ بھی ترک نہیں کر سکتا۔ جو خارجی دنیا سے ہم پر انتہائی زور اور تباہ کن انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں اور آخر کار ہمارے دیگر لوگوں سے تعلقات کی بنا پر مؤخر الذکر سرچشمہ سے ہمیں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ شاید اوروں سے کہیں زیادہ پُر درد ہوتی ہے ہم اسے بلا ضرورت اضافہ خیال کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ اٹل انجام کسی طرح اس مصیبت سے کم نہیں۔ جو دوسرے سرچشموں سے پیدا ہوتی ہے۔

اور یہ قابلِ حیرت بات نہیں ہے۔ اگر مصائب کے خوف سے دب کر انسانیت خوشی حاصل کرنے کی تمنا کو کم کر دے بلکہ ایسے جیسے قانون لذت پرستی داخلی اثرات کے ماتحت اپنے آپ کو تحکیلے قانون حقیقت کاری کے مطابق

---

[1] حتیٰ کہ گوئٹے ہمیں متنبہ کرتا ہے "کوئی شے برداشت کرنی اتنی مشکل نہیں جتنا کہ پر مسرت دنوں کا سلسلہ"۔ بایں ہمہ یہ مبالغہ ہو سکتا ہے۔

ڈھال لیتا ہے۔ اگر انسان فقط تکلیف سے بچ نکلنے یا اس کا مقابلہ کر کے خوشی حاصل کرتا ہے۔ اگر عموماً دکھ درد سے گریز کرنا ہمیں عیش و تفریح کو پسِ پشت ڈالنے پر مجبور کرتا ہے۔ غور و خوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کام کو سرانجام دینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان سب کو فنِ زندگی کے مختلف طرزِ افکار نے سراہا ہے اور لوگوں نے ان پر عمل کیا ہے۔ تمام خواہشات کا بلا قابو آسودگی کا زبردستی اپنے آپ کو پسِ پشت ڈالنا زندگی میں دل کش ترین اصول بن جاتا ہے لیکن یہ لازم قرار دیتا ہے کہ آدمی کو اس سے لطف اندوز ہونے کو احتیاط پر ترجیح دینی چاہیئے اور تھوڑی سی نفس پرستی کے بعد اپنے آپ کو سزا دیتا ہے دوسرے طریقے، جن میں گریز بنیادی محرک ہوتا ہے کو ان سرچشموں کے مطابق ایک دوسرے سے ممتاز کیا جاتا ہے جن کے خلاف خاص طور سے ان کا رخ پھیر دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ اقدامات کو انتہائی اور کچھ درمیانے قسم کے ہوتے ہیں، کچھ یک طرفہ اور کچھ ایک بات کے مختلف پہلوؤں کو بیک وقت نپٹتے ہیں۔ اپنی مرضی سے تنہائی اختیار کرنا، اور دوسروں سے علیحدگی اس تکلیف کا تیار ترین طریقہ ہے۔ جو انسانی تعلقات سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے اس طرح اسے اگر جو مسرت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوفناک بیرونی دنیا سے مڑ کر کسی اور طرف رجوع کرنے سے وہ صرف اسی طرح اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ اس صورت میں جب آدمی اس سوال کو اکیلا ہی حل کرنا چاہتا ہو۔

لیکن اس کے علاوہ اس کا، بے شک ایک اور بہترین طریقہ بھی ہے وہ باقی دنیا کے ساتھ مل کر قدرت پہ حملہ کرنا ہے تاکہ سائنس کی مدد سے اسے

انسانی قوتِ ارادی کا تابع کیا جائے۔ اس صورت میں آدمی سب کی بہتری کے لیے کام کرتا ہے۔ درد کو دور کرنے کا طریقہ وہ نہیں ہے جس سے ترتیب اعضا کو فی نفسہٖ متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آخری تجزیے میں تمام درد درحقیقت حس ہوتا ہے۔ اس کا وجود اس حد تک ہوتا ہے جہاں تک ہم اسے محسوس کرتے ہیں اور جیسے ہم اپنے جسم کی مخصوص ساخت کی وجہ سے ہی محسوس کرتے ہیں۔

ان میں سے جسم کو متاثر کرنے کا سب سے بھدا لیکن اس کے باوجود موثر ترین طریقہ کیمیائی ہے۔ میرے خیال میں کوئی شخص اس کے عمل کو پوری طرح نہیں سمجھتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے جسم کے نزدیک کچھ ایسا غیر قسم کا مادہ ہوتا ہے جو اگر خون اور ریشوں میں موجود ہو تو ہمارے اندر براہ راست احساس لذت پیدا کر دیتا ہے۔ بایں ہمہ اس کے ساتھ ہماری قوتِ حس کی بیداری کو اس طرح تبدیل کر دیتا ہے کہ ہم ناپسند محسوسات سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں اثرات نہ صرف بیک وقت رونما ہوتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جسم کی کیمیائی ساخت میں کچھ ایسے مادے ہوں گے جو اس قسم کا اثر پیدا کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں کم از کم ایک روگیلی (MORBID) کیفیت ‘MANIA’ کا علم ہے جو کسی نشئی چیز کے رگ و پے میں سرایت کرنے کے بغیر اس قسم کی مدہوشی پیدا کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری عام زندگی اس قسم کی تبدیلیاں ظاہر کرتی ہے جن سے لطف تو کم و بیش آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جن پر تکلیف کو کم یا زیادہ محسوس کرنے کا انحصار رہتا ہے۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اب تک محقق سائنس داں کی نظر ان ذہنی کیفیات پر نہیں پڑی نشئی اشیا

لے مسرت حاصل کرنے اور آفت کے دور کرنے میں افادی اعتبار سے اتنی خدمات سرانجام دی ہیں کہ آدمی نے انفرادی اور نسلی طور پر اسے نظامِ تنظیم قوتِ جنس (LIBIDO ECONOMY) میں مستقل جگہ دیدی ہے اس کی وہ فوری حظ ہی نہیں جو آدمی ان سے حاصل کرتا ہے، بالکل بیرونی دنیا سے کسی حد تک آزادی حاصل کرنا جس کا وہ اتنا متمنی ہوتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ اپنے تفکرات کو غرق کرنے میں انھیں اس سے کتنی مدد ملتی ہے۔ وہ جب چاہیں حقیقت کے ظلم واستبداد سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں اور اپنی ایک ایسی دنیا میں امان ڈھونڈھ سکتے ہیں جس میں پر درد احساسات داخل نہیں ہو سکتے ہمیں معلوم ہے کہ نشی اشیاء کی یہی خاصیت خوفناک اور نقصان دہ ہوتی ہے چند ایک حالات میں انھیں قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ جب وہ قیمتی طاقتوں کو انسانیت کو بہتر بنانے میں صرف کرنے کی بجائے ضائع کر دی جاتی ہیں۔

بایں ہمہ ہماری ذہنی زندگی کی پیچیدہ ساخت میں ایک مکمل سلسلے اور قسم کے عمل فعل کی گنجائش ہے۔ جبلی خواہشات کی آسودگی سے مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن جب خارجی دنیا ہمیں فاقوں مارتی ہے، ہماری ضروریات کو پورا کرنے سے انکار کرتی ہیں تو وہ دکھ درد کا باعث بن جاتی ہیں۔ یوں یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ انھیں قابو میں لانے سے آدمی کسی حد تک مصیبت سے فرار حاصل کر سکتا ہے۔ درد سے اس قسم کے بچاؤ کا حواس خمسہ سے اب کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ یہ ہماری ضروریات کے سرچشموں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی ایک انتہائی صورت تو جبلی حرکات

کو تہہ و بالا کرنا ہے جیسا کہ حکمت مشرق میں لکھا ہے اور جس پر یوگی عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب یہ کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ دیگر حرکات کو ترک کرنے کا باعث بن جاتی ہے (تمام زندگی کو قربان کرنا) اور اگر دوبارہ یہ کسی راستے سے خوشی کا موجب بنتی ہے تو وہ سکون کی پیداوار ہے۔

جب مدعا اتنا بلند نہیں ہوتا اور صرف جبلی حرکات پر قابو پانا ہی مقصود ہوتا ہے۔ تو وہی راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اعلیٰ ذہنی نظام، جو قانون حقیقت کاری کو تسلیم کر لے ہیں، غالب آجاتے ہیں۔ تاہم اس حالت میں نفس پرستی کو کسی طرح بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ مصیبت سے کسی حد تک بچاؤ حاصل ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے کہ جب جبلی حرکات کو قابو میں رکھا جاتا ہے تو وہ اتنی تکلیف نہیں دیتیں جتنی کہ اس حالت میں، جب انھیں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس یہ اس لطف کی وسعت کو بلاخدشہ کم کر دیتا ہے، جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ ایک جنگلی، غیر مہذب ہوس یکتا حد تک کسی مغلوب خواہش سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ کجرو جبلی خواہشات کی کشش اور شاید عموماً ممنوع شے کی دل کشی کی تنظیمی اعتبار سے تشریح کی جا سکتی ہے۔ درد سے بچنے کا ایک اور طریقہ جنسی قوت (LIBIDO) کے ان ہٹا (DISPLACEMENTS) کے استعمال کرنے سے ملتا ہے جن کی ہماری ذہنی ساخت میں گنجائش ہوتی ہے اور جس کے باعث وہ اتنا لچکدار ہو جاتا ہے تو پھر جبلی حرکات کے مقاصد کو ان جوانب تبدیل کرنا مطلوب ہوتا ہے تاکہ بیرونی دنیا انھیں ناکام نہ کر سکے جبلی حرکات کا ترفع (SUBLIMATION)

اس معاملے میں مدد دیتا ہے۔ اسے تب عظیم ترین کامیابی حاصل ہوتی ہے جب انسان ذہن اور عقل سے لطف اندوز ہونے کی قابلیت کو خاصی بلندی تک پہنچا دے تب تقدیر کا اس سے مقابلہ کرنا فضول ہوتا ہے۔ اس قسم کی تسکین فن کار کو اپنے خوابوں کو تخلیقی جامہ پہنانے سے حاصل ہوتی ہے یا سائنس داں کو مسائل کو حل کرنے اور حقیقت دریافت کرنے سے۔ یہ ایک ایسی خاصیت ہے جس کی ہم مابعد نفسیات کی رو سے تشریح کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تب تک ہم استعارۃً صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمیں "بلند اور نفیس" معلوم ہوتی ہے لیکن قدیم اور بے ہنگم جبلی حرکات کی تشفی کے مقابلے میں ان کی شدت معتدل اور بکھری سی ہے۔ جسمانی اعتبار سے یہ ہم پر غالب نہیں ہوتی۔ اس طریقے میں یہ کمزوری ہے کہ اس کا عام استعمال نہیں ہو سکتا۔ بہت کم لوگ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے خاص اوصاف اور رجحانات کا موجود ہونا لازم ہے جو عموماً معقول مقدار میں نہیں ملتے۔ چند لوگوں کو جن میں یہ پائی جاتی ہے یہ مصائب سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ تقدیر کے تیروں کے سامنے یہ ناقابلِ مجروح بکتر کا کام نہیں دیتے اور اس حالت میں جب انسان کا جسم باعثِ اذیت بن جاتا ہے۔ وہ بیکار ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] جب انسان میں کسی خاص قسم کا رجحان موجود نہ ہو جس سے وہ اپنی زندگی کے رخ کا تعین کر سکے تو روزی کمانے کا عام کام جو سب لوگ کر سکتے ہیں، وہی اہمیت حاصل کر لیتا ہے جس کے متعلق والٹیر کا قول ہے، اُسے ہماری زندگی میں ہونی چاہیے۔ ایک مختصر جائزے کی حدود میں قوتِ جنسی کی اہمیت تنظیمی (ECONOMIC) پر بحث کرنا ممکن نہیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۱ پر)

یہ رویہ واضح طور پر اپنا مقصد ظاہر کرتا ہے — یعنی اپنے مسرت کے سوتوں کے اندرونِ ذہن "تلاش کر کے اپنے آپ کو خارجی دنیا سے آزاد کرنا، دوسرے طریقے میں وہی خصوصیات زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

حقیقت کے ساتھ رشتہ اس سے بھی زیادہ کچا ہوتا ہے۔ فریبوں کے ذریعہ تسکین حاصل کی جاتی ہے۔ حقیقت اور ان کے آپس میں تفاوت سے" قطعِ نظر ان سے جو شادمانی پیدا ہوتی ہے اُسے فی نفسہٖ قبول کیا جاتا ہے۔ یہ فریب اس دنیائے تصور کی پیداوار ہوتا ہے، جسے احساس حقیقت کے ترقی کرنے پر صاف طور پر حقیقت کاری کے امتحان سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے الگ کر دیا گیا جن کا پورا کرنا نہایت مشکل ہوگا۔ ان تصوری لذتوں میں پہلا مقام کارہائے فن سے لطف اُٹھانا ہے، جن تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٠) کام کرنے پر زور دنیا کسی اور اسلوب زندگی سے اس لئے زیادہ مؤثر ہے کیونکہ یہ آدمی کو حقیقت سے زیادہ جکڑ دیتا ہے۔ اپنے کام میں مشغول رہنے سے وہ کم از کم حقیقت کے ایک حصے سے مضبوط طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ انسانی جماعت سے۔ اس سے کام کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ یہ قوتِ جنسی کے مشتعل ہیجانات اور خود پسند، حملہ آور بلکہ شہوانی خواہشات کے لئے کافی حد تک اخراج کے مواقع بہم پہنچاتا ہے، نہ کہ اس لئے کہ یہ زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے اور سماج میں ان کے حق کو ثابت کرتا ہے۔ روزی کمانے کے روزمرہ کے کام کرنے سے اس وقت سکون ملتا ہے جب یہ اپنی مرضی سے منتخب کیا جائے۔

جب ترفع کے ذریعہ یہ موجودہ رجحانات جبلی حرکات کو جنھوں نے اپنی طاقت برقرار رکھی ہو، یا جسمانی وجوہات کی بنا پر شدید تر ہو گئی ہو، کام آنے کے قابل بنا دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود کام سے خوشی حاصل کرنے کے ایک ذریعہ کی حیثیت میں لوگ اس کی بہت زیادہ قدر نہیں کرتے۔ یہ اس کے اتنے متلاشی نہیں ہوتے جتنا کہ تسکین کے دیگر مواقعوں کے۔ بیشتر اکثریت انتہائی ضرورت کے وقت ہی کام کرتی ہے اور کام سے اس قسم کی قدرتی نفرت انتہائی مشکل سماجی مسائل پیدا کرتی ہے۔

فن کار کی وساطت سے ان لوگوں کی رسائی ہو جاتی ہے جو خود تخلیق نہیں کر سکتے[۱۵]۔ وہ لوگ۔ جو آرٹ کے با اثر ہونے کے معاملے میں ذی حس ہوتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ زندگی میں مسرت اور تسکین کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اس کی کسی حد تک قدر کرنی چاہیئے۔ بایں ہمہ ہم آرٹ سے یوں متاثر ہوتے ہیں جیسے کہ وہ ایک ہلکا سا نشہ ہو۔ جو زندگی کے مصائب سے عارضی قرار فراہم کرنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ ہمیں حقیقت سے بے خبر کر دے۔

ایک اور طریقہ زیادہ زور آور اور کارگر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کو تمام مصائب کی جڑ گردانتا ہے۔ ایک اور صرف ایک دشمن جس کے نزدیک زندگی ناقابلِ برداشت نہیں ہے اور جس سے، اگر آدمی کو نے کسی طرح خوش رہنا ہے، تمام تعلقات منقطع کر دیئے جائیں گوشہ نشین دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ وہ اسے از سرِ نو بنا سکتا ہے، اس کی بجائے ایک اور دنیا تعمیر کر سکتا ہے۔ جہاں سے ناقابلِ برداشت خصوصیات کو نکال کر ان کو جگہ دی جاتی ہے جو خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں۔ وہ شخص جو مایوس یا باغی ہو کر اس راستے پر چل نکلتا ہے وہ اصولاً بہت دور نہیں جا سکے گا۔ حقیقت اس کے لئے بہت زبردست ثابت ہو گی۔ وہ پاگل ہو جاتا ہے اور عموماً اسے کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا جو اس کے پُر فریب تصور کو

Q! C.H FORMULATIONS REGARDING PRINCIPLES IN MENTAL DEVELOPMENT. (1911) COLLECTED PAPERS, VOL, IV, AND INTRODUCTRY LECTURES ON PSYCHO; ANALYSIS (1915-17,) LONDE CHPT. XXiii)

عملی جامہ پہنائے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس لحاظ سے PARANOIC کی حرکتیں کرتا ہے ـــــ دنیا کے کسی ناگوار پہلو کی جگہ تصوّر ہی میں خواہشات کا پورا کرنا اور اس واہمہ کو حقیقت میں تبدیل کرنا جب لوگوں کی بہت بڑی تعداد مل کر حقیقت کو توہم پرست DELUSIONAL طریقے سے تبدیل کر کے یقینی مسرت اور مصائب سے بچنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ امر بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ انسانیت کے مذاہب کو بھی اس قسم کے اجتماعی وہمات میں شمار کرنا چاہیے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر شخص کسی نہ کسی وہم کا شکار ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس کی نوعیت کو نہیں پہچانتا۔

میرے خیال میں میں نے وہ تمام طریقے گنوا دیے ہیں جن سے آدمی مسرت حاصل کرنا اور رنج والم کو دور رکھنا چاہتا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس مواد کو کسی مختلف طریقے سے بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک طریقے کا میں نے اب تک قطعاً ذکر نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ میں اسے بھول گیا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ ہمارے لئے کسی اور ضمن میں دلچسپ ثابت ہو گا۔ زندگی کے فن کو عمل میں لانے کے طریقوں میں سے اس طریقے کو نمایاں خصوصیات حاصل کرنے کی غیر معمولی اہلیت ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ بھی تقدیر سے آزاد ہونا چاہتا ہے ـــ اگر ہم زیادہ سے زیادہ اسے یہ رعایت دیدیں۔ اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے ذہنی سکون تلاش کرتا ہے اور قوتِ جنسی کو جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے استعمال میں لاتا ہے لیکن یہ دنیا سے منہ نہیں موڑتا۔ اس کے برعکس اس کی چیزوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور ان سے جذباتی

رشتہ پیدا کر کے ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ درد و کرب سے گریز کرنے پر بھی اکتفا نہیں کرتا — بیزار سپردگی کی منزل — بلکہ یہ لاپرواہی سے اُسے نظرانداز کر دیتا ہے اور یقینی، ٹھوس خوشی حاصل کرنے کے لئے جبلی والہانہ کوشش کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ غالباً یہ فی الحقیقت کسی اور طریقے کی بجائے اس منزل کے قریب آ جاتا ہے۔ میں بے شک اس طرزِ زندگی کا ذکر کرتا ہوں جس میں محبت تمام چیزوں کا مرکز ہوتی ہے۔ ہر قسم کی کامرانی کو محبت کرنے اور کروانے کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس قسم کے نظریے سے تو ہم سب خوب واقف ہیں۔ محبت کی ایک صورتِ اظہار — جنسی محبت — کا ہمیں جنسی لذت میں غرق ہو جانے کا شدید ترین موقع بہم پہنچاتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا اتنا قدرتی ہو سکتا ہے کہ ہم اسی طریقے سے دوبارہ مسرت تلاش کرتے جائیں جس سے ہم پہلی مرتبہ اس سے روشناس ہوئے تھے۔ جینے کے اس طریقے کی کمزوری واضح ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوتی تو کوئی شخص خوشی حاصل کرنے پر کسی اور کو ترجیح نہ دیتا۔ ہم کبھی اتنے غیر محفوظ نہ ہوتے جتنا کہ محبت کرتے وقت، کبھی اتنے تنہا، ناشاد محسوس نہ کرتے جتنا کہ اس وقت جب ہم یا تو محبوب کو یا اس کی محبت کو کھو کر۔ لیکن اس سے طرزِ زندگی کا وہ پہلو مکمل نہیں ہوتا جو شادمانی کی محبت پر بنیاد رکھتا ہے۔ اس کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔

یہاں ہم لگے ہاتھ اس دلچسپ کیفیت پر بھی غور کر لیتے ہیں جس میں مسرت اوّل و آخر حسن سے لطف اٹھانے کی تلاش سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کبھی ہماری ذہنی حسیات اور ہماری عقل کو حسن انسانی کی اور حرکات، قدرتی اشیا، میدانی

مناظر، حتیٰ کہ سائنسی تخلیقات کی صورت میں مل جاتا ہے۔ حسن سے محظوظ ہونا ایک مخصوص قسم کی نشہ آور کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر تو حسن کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمدنی مقاصد کے لئے اس کی ضرورت پیش آنا عیاں ہے، تاہم تہذیب اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جمالیاتی سائنس ان کیفیات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے جن میں چیزوں کو حسین گردانا جاتا ہے۔ یہ حسن کی نوعیت اور ابتدا کے متعلق کوئی شرح پیش نہیں کر سکتی جیسا کہ ہوتا ہے۔ اس کا عدم نتائج ہونا گونجدار اور بے معنی الفاظ میں مشہور ہے۔ بدقسمتی سے تجزیہ نفس بھی باقی مسائل کی نسبت اس پر کم روشنی ڈال سکتا ہے۔ جو کچھ یقینی معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جنسی محسوسات کی دنیا اس کی پیداوار ہے۔ حسن سے محبت رکے (INHIBITED) ہوئے مطمح نظر کی بہترین مثال ہے "حسن" اور "کشش" اول تو ایک جنسی چیز کی خصوصیات ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اعضائے تناسل جنہیں دیکھنا ہمیشہ اشتعال انگیز ہوتا ہے، کبھی خوبصورت نہیں سمجھے گئے۔ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن ثانوی جنسی خصوصیات سے وابستہ ہوتا ہے۔

ان نظریات کے نامکمل ہونے کے باوجود میں اس بحث کے آخر میں کچھ باتیں کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ منزل جس کی طرف ہمیں قانون لذت پرستی دھکیلتا ہے ـــ خوشی حاصل کرنا ـــ نہیں مل سکتی ـــ بایں ہمہ ہم ـــ نہیں ہم اس کے ناقابل ہیں ـــ شاید کسی نہ کسی اور طریقے سے اسے تقریباً حاصل کرنے کی کوشش کو ترک کر دیں۔ اس کے حصول کے لئے مختلف راستے اختیار کئے جا سکتے ہیں کبھی تو اس مقصد کی ٹھوس پہلو کی تلاش جاری رکھتے ہیں۔ حصول

مسرت — دوسرے منفی — ورد سے اجتناب — اس ترمیم شدہ صورت میں، جس میں ہم نے دیکھا ہے کہ وہ مل سکتی ہے۔ مسرت ہر شخص میں جنسی قوت کی مقدار کا سوال ہے۔ اس معاملے میں کوئی اکسیر علاج نہیں ہے۔ جو سب کے موافق حال ہو۔ ہر شخص کو اپنے نقطۂ نگاہ سے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کس طریقے سے شادماں ہو سکتا ہے۔ انواع و اقسام کے عناصر کی وجوہات اس کے انتخاب کے تعین پر اثر انداز ہوں گے۔ اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ خارجی دنیا سے کتنی حقیقی شادمانی حاصل کر سکے گا اور کس حد تک اپنے آپ کو اس سے آزاد کرنا ضروری سمجھے گا۔ آخر میں اس کا انحصار اُس کے اپنے اندر اس یقین پر بھی ہوگا کہ آیا وہ انہیں اپنی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس مقام پر آدمی کی ذہنی ساخت، اور عناصر کے علاوہ فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ وہ شخص جو بدرجۂ اتم شہوت پرست ہے، سب سے پہلے دوسروں کے ساتھ جذباتی رشتہ پیدا کرنا پسند کرے گا۔ خود پسند قسم، جو زیادہ خود کفیل ہوتا ہے، اپنی روح کے اندرونی اعمال سے تسکین حاصل کرے گا۔ عملی قسم کا آدمی کبھی بیرونی دنیا کو نہیں چھوڑے گا، جس میں وہ اپنی طاقت کا امتحان لے سکتا ہے۔ خود پسند آدمی کی دلچسپیوں کا تعین، اس کے مخصوص گن اور جبلی ترفع کی وسعت، جس کے وہ اہل ہیں، ہی کر سکتے ہیں۔ جب کوئی مرغوب طرزِ عمل انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کو کسی شرکت بلا غیر زندگی کے مقصد سے وابستہ خطرات میں ڈال دیتا ہے جو ہمیشہ ناکافی ہوتا ہے۔ جیسے ایک محتاط تاجر اپنا تمام سرمایہ ایک ہی کاروبار میں لگانے

سے گریز کرتا ہے۔ اس لیے عقل مندی تو ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ ہم ایک ہی جانب سے اپنی تمام شادمانی حاصل کرنے کی توقع نہ رکھیں۔ کامیابی کبھی یقینی نہیں ہوتی۔ یہ بہت سے عناصر کے ملنے پر منحصر ہوتی ہے۔ شاید کسی عنصر پر اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ ذہنی ساخت کے اپنے آپ کو بیرونی دنیا کے مطابق ڈھالنے کی اہلیت پر، اور اس طرح موخرالذکر سے مستفید ہونا۔ جو کوئی کسی خاص ناموافق جبلت ورثے میں لے کر پیدا ہوا ہے اور جس کے اجزا جبلی سرچشمہ زندگی میں بعد ازاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری اصلاح و ترمیم قبول نہیں کرتے۔ ان کے لیے اپنے بیرونی ماحول سے خوشی حاصل کرنا مشکل ہوگا، خاص طور پر اس حالت میں جب اسے مشکل تر مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زندگی سے نپٹنے کی ان لوگوں کے لیے ایک ممکن صورت رہ جاتی ہے۔ جو انھیں حقیقی لذتوں کے نعم البدل مہیا کرتی ہے۔ یہ NEUROTICILLNESS دماغی خلل کی صورت میں فرار ہے اور ایسے لوگ اکثر بچپن میں بھی ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں آن کی حصول شادمانی کی کوشش مابعد عمر میں ناکام رہ جاتی ہے۔ اس میں نشہ کرنے کی کہنہ عادت پڑ جاتی ہے جس سے انھیں تسکین ملتی ہے وگرنہ وہ مایوس ہو کر باغیانہ اقدام اٹھاتے ہیں۔ دیوانگی (PSUCHOSIS)، مذہب ہر شخص کو خوشی حاصل کرنے کے لیے اور درد سے بچنے کے لیے اپنے واحد راستے پر چلنے کی تلقین کر کے انتخاب اقدامات اور مطابقت کو محدود کر دیتا ہے۔

یہ طریقہ زندگی کی مذمت کرنے اور اصل دنیا کے متعلق ایک ایسا نظریہ مشتہر کرنے پر موقوف ہے جو ایک خیال خام کی طرح ٹیڑھا ہے اور دونوں کا ادراک

پر خوفناک اثر پڑتا ہے ۔ اس کی اتنی قیمت ادا کرکے ۔ اجتماعی فریب اور طفلانہ ذہانت زبردستی ٹھونسنے سے مذہب انفرادی طور پر کئی لوگوں کو دماغی خلل سے بچاتا ہے ۔ چند ایک الفاظ اور یہ ہیں ۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ، بہت سے ایسے طریقے ہیں جن سے آدمی کو وہ شادمانی مل سکتی ہے جو قابل حصول ہے لیکن کوئی ایسا نہیں جو اسے وہاں تک پہنچا سکے ۔ تاہم مذہب ایسے وعدے پورا کرتا ہے ۔ جب ایماندار آخر کار اپنے آپ کو خدا کے ”ناقابل فہم حکم“ کی بات کرنا چاہتے ہیں ، وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے پاس فقط یہ رہ جاتا ہے کہ وہ باقی ماندہ تشفی کو ذریعہ شادمانی کے طور پر اس کی غیر مشروط اطاعت بجا لائیں ۔ اگر ایک آدمی اتنا کرلینے کے لئے تیار ہے تو وہ اس مقام پر کسی چھوٹے راستے سے بھی پہنچ سکتا تھا ۔

۳

شادمانی کے متعلق ہماری بحث سے کوئی اس قسم کا نتیجہ نہیں نکلا جسے پہلے ہی سے لوگ نہ جانتے ہوں۔ مزید بہتر معلومات حاصل ہونے کی امید تب نظر آتی ہے جب ہم اس بات کا استفسار جاری رکھیں کہ انسانیت کے لئے شادمانی حاصل کرنا کیوں کر مشکل ہے۔ ہم نے اس سوال کا جواب پہلے بھی دیا ہے، جب ہم نے انسانی مصائب کے تین اسباب کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی قدرت کی برتر طاقت، ہمارے اجسام کا مائل بہ بوسیدگی ہونا اور ہماری جماعت اور ریاست میں ان طریقوں کا انسانی تعلقات درست رکھنے کے لئے ناکافی ثابت ہونا۔ جہاں تک پہلے دو عناصر کا تعلق ہے ہماری رائے کسی لحاظ سے لرزش نہیں کھاتی۔ یہ ہمیں ان مصائب کی جڑوں کو تسلیم کرنے اور ان کے اٹل ہونے کے تابع ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم قدرت کو کبھی مکمل طور پر تسخیر نہیں کر سکیں گے۔ ہمارا جسم بھی

ایک پیچیدہ جاندار شے ہے جو بذاتِ خود قدرت کا ایک جزو ہے جس میں فنا کے عناصر شامل ہیں اور جن کی اپنے آپ کو مناسب حال کرنے اور کامیاب ہونے کی طاقتیں محدود ہیں۔ ان حقائق کو تسلیم کرنے کا اثر حوصلہ شکن نہیں ہے! اس کے برعکس یہ ہماری کاوشوں کی راہبری کرتا ہے۔ گو ہم تمام تکلیفوں کو ختم نہیں کر سکتے، لیکن ان میں سے بیشتر کو کم زیادہ سے زیادہ کم کر سکتے ہیں۔ ہزارہا سال کے تجربے سے ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے۔ سو ہم، اپنے رنجوں کے سماجی سبب کے بارے میں ہم کوئی اور زاویۂ نگاہ قائم کرتے ہیں۔ ہمارا ان مسائل کو ایک نہ سمجھنا بہتر ہے۔ ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ نظام جو ہم نے خود بنائے ہیں، ہماری حفاظت اور خوش حالی کے کیوں ضامن نہیں بنتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم جب اس اعتبار سے سوچتے ہیں کہ تکالیف سے بچانے کی ہماری کوششیں کتنی ناکام ثابت ہوتی ہیں تو ہمیں یہ شک ہوتا ہے۔ کہ اس مشکل کے پس منظر میں بھی ناقابل تسخیر قدرت کا کچھ حصہ پنہاں بیٹھا ہے، ہماری ذہنی ساخت کی صورت میں۔

جب ہم اس امکان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسا نظریہ ملتا ہے جو آتنا حیرت انگیز ہے کہ ہم اس مقام پر تھوڑی سی دیر کے لئے رک جائیں گے۔ اس کے مطابق ہماری نام نہاد تہذیب فی نفسہٖ ہماری زبوں حالی کے کافی حصہ کی ذمہ دار ہے اور ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوگی اگر ہم اسے چھوڑ کر دوبارہ قدیم طرزِ زندگی اختیار کر لیں۔ میں اسے حیرت انگیز کہتا ہوں کیونکہ ــــ خواہ ہم تمدن کی کیسے ہی تعریف کریں ــــ یہ ناقابل تردید ہے کہ وہ ذریعہ جس سے ہم اپنے آپ کو زبوں حالی کی جن متعدد وجوہ سے پیدا شدہ خطرات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ

اس تمدن کا ایک جزو ہے۔

کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے تہذیب کے خلاف اس قسم کا رویہ اختیار کر لیا ہے؟ میری رائے میں اس کا پس منظر تہذیب کی موجودہ حالت، وہ دیرینہ بیماری ہے جس کی یہ پیداوار ہے، جو آخر کار چند تواریخی واقعات کی بنا پر اس رائے میں واضح ہو جائے گی میرا اعتقاد ہے کہ میں آخری دو میں تمیز کر سکتا ہوں۔ میں اتنا عالم نہیں ہوں کہ تاریخ نسل انسانی کی کڑیوں کو شروع سے گنوا سکوں۔ اس وقت جب عیسائیت نے کافروں کے مذاہب پر فتح پائی تو اس وقت مدت تک تمدن کی مخالفت بھی جاری رہی ہو گی۔ اس کا عیسائی عقیدے کی دنیاوی زندگی کے متعلق بُری رائے سے گہرا تعلق ہے۔ تاریخ کی ان دو آخری ترقی کی منازل میں پہلی بحری سفر کی دریافت سے منتج ہوئی، جس کے ذریعہ لوگوں کو قدیم قوموں اور نسلوں کی موجودگی کا پتہ چلا۔ یورپ کے باشندے، جو ان کا بغور شاہدہ نہ کر سکے اور جنھوں نے جو کچھ دیکھا غلط سمجھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ لوگ نہایت سادہ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں ــــ جنھیں کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ــــ جیسے وہ سیاح لوگ، جو اپنے تمام اعلیٰ تمدن کے باوجود ان لوگوں کو دیکھنے جاتے، حاصل نہ کر سکے۔ مابعد تجربات نے اس رائے کے کئی پہلوؤں کو صحیح ثابت کر دیا۔ بعض جگہ زندگی کے پُر آسائش ہونے کی وجہ قدرتی ذرائع کی فراوانی اور انسان کی بیشتر ضروریات کے فوری پورے ہو جانے کے امکانات تھے۔ لیکن اسے غلطی سے تہذیب کے پیچیدہ عناصر کی عدم موجودگی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ان دو آخری تواریخی واقعات میں سے ایک کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ

صورت اس وقت پیدا ہوئی جب لوگوں نے ان دماغی خلیوں کو سمجھنا شروع کردیا جن سے یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ تہذیب انسان کی خوشی کی بچی کھچی پونجی کو اندر ہی اندر سے صاف کردیں گے۔ یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کے دماغ میں اس لئے خلل پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس حد تک محرومی برداشت نہیں کرسکتے جو سماج ان پر تمدنی آدرشوں کے پیش نظر عائد کرتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر ان معیاروں کو پست یا نرم کردیا گیا تو ان سے دوبارہ خوشی حاصل کرنے کی طرف واپس لوٹنے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

اور علاوہ ازیں یاس کا بھی کچھ عنصر موجود ہے پچھلے دور کے انسان نے طبعی سائنسوں اور ان کے اصطلاحی استعمال میں انسان کی غیر معمولی ترقی کی منزلیں طے کرلی ہیں اور قدرت پر اپنا تسلط اس طرح جما لیا ہے کہ پہلے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا اس کی آگے کی طرف ترقی کی تفصیلات کو ساری دنیا جانتی ہے۔ انھیں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ بنی نوع انسان کو اپنے کارنامے پر فخر کرنا چاہیے۔ اور اسے اس کا حق بھی پہنچتا ہے لیکن انسان نے محسوس کرلیا ہے کہ زمان و مکاں پر اس نے نیا نیا قابو پایا ہے، قدرتی طاقتوں کی یہ تسخیر دیرینہ خواہشات کے اس طرح پورے ہونے سے اس کی خوشی کی مقدار میں اتنا اضافہ نہیں کیا جتنی کہ وہ زندگی میں حاصل کرسکتے ہیں۔ انھیں کسی طرح بھی زیادہ خوش نہیں کیا۔ اس سے جائز نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ قدرت پر غلبہ پانا انسان کے مسرت حاصل کرنے کی صرف ایک شرط نہیں جیسی کہ یہ تمدن کی کاوشوں کی ایک بھی منزل نہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کوئی بنیاد نہیں کہ فنی ترقی

شادمانی کے نقطۂ نگاہ سے فضول ہے۔ یہ آدمی کو ایسا اعلان کرنے پر اکساتی ہے تو پھر کیا، یہ ٹھوس لذت مسرت میں ایک قطعی اضافہ ہیں مضمر ہے کہ جب میں چاہوں ایک بچہ، جو سو میل دور رہتا ہے، کی آواز سن سکوں یا جوں ہی ایک دوست اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے تو فوراً یہ معلوم کر سکوں کہ وہ لمبے اور تکلیف دہ بحری سفر کو بخیر و عافیت طے کر آیا ہے اور کیا یہ اہم نہیں کہ طبی سائنس چھوٹے بچوں کی تعداد اموات، بچے کی پیدائش کے دوران میں عورتوں کی متعدی بیماریوں کے خطرات کو کم کرنے میں بے حد کامیاب ہوئی ہے اور بلا شک و شبہ اس نے انسانی عمر کی اوسط بڑھا دی ہے اور ابھی آدمی فوائد کی ایک اور ایسی لمبی فہرست میں اضافہ کر سکتا ہے جو انتہائی ملعون سائنس اور عملی ترقی کے دور میں پہنچے ہیں۔ لیکن ایک تنقیدی، قنوطی آواز اپنے آپ کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ ان فوائد میں سے بیشتر حکایتی سوقیانہ لذتوں کے نمونے پر مبنی ہیں۔ آدمی کو اس قسم کا لطف شب خوابی کے لباس میں سرما کی ایک ٹھنڈی رات کو اپنی برہنہ ٹانگ بستر سے باہر نکال کر اور پھر اندر کرنے سے بھی مل سکتا ہے۔ اگر ریل گاڑی نہ ہوتی اور فاصلے کم نہ ہوتے تو میرا بچہ کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتا اور مجھے اس کی آواز سننے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر سمندر کو عبور کرنے کے لئے کوئی جہاز نہ ہوتا تو میرا دوست کبھی سفر نہ کرتا اور اس کے متعلق اپنی تشویش کو کم کرنے کے لئے مجھے تار کی ضرورت نہ پڑتی۔ بچوں کی تعداد اموات میں ایسی تخفیف کرنے سے کیا فائدہ جب یہی تخفیف انھیں پیدا کرنے میں ہم پر سخت ترین اعتدال عائد کرتی ہے۔ نتیجتاً جب ہم مجموعی طور پر اس بات کا

جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اتنے بچے نہیں پالتے جتنے دورِ حفظانِ صحت سے پہلے پالا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم نے ازدواجی زندگی میں جنسی تعلقات کے لئے بہت سی مشکلات پیدا کردی ہیں، اور غالباً قدرتی انتخاب کے فائدہ مند اثرات کو ضائع کر دیا ہے۔ پھر ہمیں عمرِ دراز سے کیا حاصل ہوتا ہے، جب یہ مصائب سے پُر ہے اور ہم خوشنودی کے لئے ترستے ہیں اور اپنی حالت اتنی بدتر پاتے ہیں کہ ہم صرف موت کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہوئے اسے لبیک کہتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب ہم میں خوش حالی کا احساس پیدا نہیں کرتی لیکن اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ آیا قدیم زمانے کے لوگ مقابلتاً خوش رہتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے تمدنی عناصر کیا حصہ لیتے تھے۔ ہم مصیبت کا ہمیشہ حقیقی جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں یعنی ہم اپنے آپ کا مع اپنی ضروریات اور حسیات اس حالت میں تصور کرتے ہیں تاکہ اس حالت میں ہمیں یہ پتہ چل سکے کہ آیا ہمیں شادمانی یا غیر شادمانی حاصل کرنے کے لئے مواقع ملیں گے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کا یہ طریقہ بے شک اس لئے حتی الامکان حقیقی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم اس کے اطلاق سے اپنی ذہنی حسیات کی دوسری اقسام کو دوسرے لوگوں کے نامعلوم نظریے کی جگہ استعمال کرکے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس شادمانی ایک ایسی چیز ہے جو بنیادی اعتبار سے داخلی ہوتی ہے۔ چند مخصوص حالات کے تصور سے ہم خواہ کتنے ہی خوف زدہ کیوں نہ ہوں، مثلاً زمانۂ

قدیم میں غلام ملاح، جنگ تیس سالہ میں کسان، مذہبی تحقیقات (INQUISITION کے شکار، ظلم و تشدد کے منتظر یہودی، تاہم ان لوگوں کی کیفیات جذبات کے ذریعہ محسوس کرنا اور اختلافات کا تصوّر کرنا جن میں قوتِ احساس جسمانی ساخت کی وجہ سے کند ہو جاتی ہے، بتدریج بدحواسی، ہر قسم کی توقعات کا التوا، اور ان تمام بھدّے اور نفیس طریقوں سے جن کی مدد سے پُر لطف اور پُر درد حسی کیفیات پیدا کی جا سکتی ہیں ہمارے لئے ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں ایسے موقعوں پر جب انتہائی درد انگیز قسم کی حالتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، خاص قسم کی ذہنی تدابیر تحفظ عمل میں لائی جاتی ہیں۔ معاملے کے اس پہلو کو طول دینا مجھے بے سود معلوم ہوتا ہے۔

اب ایسا وقت آگیا ہے جب ہمیں اپنی توجہ تمدن کی نوعیت کی طرف منعطف کرنی چاہیے۔ شادمانی کے نقطۂ نگاہ سے اس کی نوعیت تب تک نہ زیر تکرار رہے گی جب تک ہم اس کی چھان بین کر کے کچھ حالات کی معلومات نہیں کر لیتے، ہم کسی ایسے فارمولے کی تلاش نہیں کریں گے جو چند ایک الفاظ میں اس کی روح کو بیان کرتا ہو، ہم اتنا دہرانے[۵] پر اکتفا کریں گے کہ لفظ تمدن ان تمام کارناموں اور اداروں کا مجموعہ ہے جو ہماری زندگی کو ہمارے حیوانی جد امجد سے مستثنیٰ کرتا ہے اور دو فوائد دیتا ہے یعنی انسانیت کو قدرت سے بچانا اور انسان کے باہمی تعلقات کو درست رکھنا۔ اس سے زیادہ نتیجہ اخذ کرنے کیلئے ہمیں تمدن کی ان منفرد خصوصیات کو یکجا کرنا پڑے گا جو موجودہ جماعتوں میں ظاہر ہیں ہمیں عام زبان کے محاوروں کی مدد لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

---

[۵] THE FUTURE OF AN ILLUSION سے مقابلہ کیجیئے۔

یا جیسا اگر کوئی کہے، احساس زبان سے، اس یقین سے کہ ہمیں یوں ان مخصوص داخلی خیالات کو پیش نظر رکھ سکیں گے جو اب تک مبہم الفاظ میں ظاہر ہونے کے خلاف ہیں۔

اس کا آغاز آسان ہے۔ ہم ان تمام کارگزاریوں کو اور وسائل واسباب کو، جنہیں آدمی زمین کو مستفید بنانے کے لئے استعمال میں لاتا ہے، تمدن کی ملکیت سمجھتے ہیں تہذیب کے اس پہلو پر دوسرے پہلوؤں کے بجائے کم شک ہوتا ہے۔ اگر ہم کافی پیچھے چلے جائیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اول مہذب کام اوزاروں کے استعمال، آگ پر قابو پانا، رہائش کے لئے مکانات تعمیر کرنا ہوگا۔ ان تمام میں آگ پر قابو پانا اہم ترین کارنامہ تھا جو بے مثال تھا۔[1]

---

[1] گو یا مواد تجزیہ نفس جو اب تک یاد رہے کہ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی تھی۔ بعد ازاں زیر بحث موضوع پر ناقابل تردید تحقیقی مواد مہیا کیا گیا ہے۔ مترجم) اب تک اتنا نامکمل اور غیر قطعی ہے اس کی تاویل پیش کی جا سکتی۔ بریں براں ایک قیاس کی اجازت دیتا ہے جو خیال آرائی معلوم ہوتا ہے، جو انسانی کارنامے کی ابتدا سے متعلق ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب قدیم انسان آگ کے نزدیک آتا تو اس میں ایک طفلانہ قسم کا ہیجان اس اعتبار سے پیدا ہوتا کہ وہ اسے پیشاب کی دھار سے بجھانا چاہتا۔ ان روایات کی بنا پر جو ہمارے پاس ہیں۔ اس بارے میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اوپر کی طرف لپکتے ہوئے شعلوں کی زبانوں کو شروع میں عضو تناسل کے معنوں میں متصور کیا جا سکتا تھا اس لئے پیشاب کی دھار سے آگ بجھانا جنہیں بعد میں للی پٹ میں گلیور اور ربیلے کی گارگینٹوا میں داخل کر دیا گیا۔ آدمی سے بدفعلی ظاہر کرتی ہیں، ہم جنسی رقابت میں قوت مردانگی سے لطف اندوزی۔ جس کسی نے پہلے پہل اپنے آپ کو اس لذت سے محروم کر کے آگ کو محفوظ کیا وہ اس پر قابض ہو گیا اور اسے اپنے مفاد کے لئے کارآمد بنایا۔ اپنے جذبات کی شہوانی آگ کو دبا کر اس نے اس آگ کو بحیثیت قدرتی طاقت مطیع کیا۔ چنانچہ یہ تمدنی فتح عظیم ایک جبلی خواہش کو پورا کرنے سے گریز کرنے کا معاوضہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ فعل کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ مرد نے عورت کو چولہے کے قریب اس آگ کا رکھوالا بنا دیا جسے اس نے قید کیا تھا۔ کیونکہ جسمانی ساخت اس کے لئے اس قسم کے لالچ کا شکار ہونا ناممکن بنا دیتی ہے۔ یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ تحقیقات نفسی متواتر امنگ، آگ اور شہوت نابیزہ (URETHRAL EROTCM) کے آپس میں گہرا تعلق رکھنے کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

اس عرصہ میں دہ گردو نے چند ایک ایسے راستے کھول دیے ہیں جن پر انسان تب سے چل رہا ہے۔ جن کے نہج کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان اوزاروں کے ذریعے انسان اپنے تمام اعضا ـ عملی اور حسّی دونوں ـ کو کامل بناتا ہے۔ ورنہ ان افعال کے راہ کی مشکلات کو دور کر دینا ہے مشین ان کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت دے دیتی ہے جسے وہ اپنے پٹھوں کی طرح، جس مقصد کے لئے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ بحری اور ہوائی جہازوں کی بدولت نہ ہی ہوا، نہ ہی پانی اسے انھیں عبور کرنے سے روک سکتے ہیں۔ عینک کے ذریعے وہ اپنے آنکھوں کے LENS کے نقائص کو دور کر سکتا ہے۔ دوربین سے وہ بعید فواصل کو دیکھ سکتا ہے۔ خوردبین سے وہ RETINA کی وجہ سے محدود قوت باصرہ کو وسیع کر سکتا ہے فوٹوگرافی کے کیمرہ کی شکل میں اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس پر ناپائدار نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں۔ بالکل گراموفون میں آواز کی لہروں کی مانند دونوں دراصل اس کی اپنی قوت یادداشت کی مادی منتقل اشکال ہیں ٹیلیفون کے ذریعہ وہ اتنی دور سے آواز سن سکتا ہے جسے پریوں کی کہانیوں میں بھی ناقابل عبور سمجھا جائے گا۔ تحریر ابتداءً دل کی آواز تھی۔ مکانات ماں کے رحم کا بدل، وہ پہلی جائے رہائش جس میں وہ محفوظ اور مطمئن محسوس کرتا تھا۔ غالباً جس کے لئے وہ ہمیشہ بعد ازاں ترستا رہتا ہے۔

یہ سب کچھ پریوں کی کہانی معلوم ہوتا ہے لیکن فقط اتنا ہی نہیں۔ آدمی نے روئے زمین پر اپنی سائنس اور قابل استعمال ایجادات کے ذریعے کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی کہانی، وہ جگہ جہاں وہ ابتداء میں عالمِ حیوانات کے ایک

کمزور رکن کی حیثیت میں نمودار ہوا اور جس پر اس کی صنف کا ہر فرد بالضرور دوبارہ ایک بے بس بچے کی صورت میں پیدا ہوگا — آہ، قدرت کے ایک ذرے نے، جو اپنے تمام یا بیشتر عزیز ترین پریوں کی کہانیوں کی تکمیل ہے۔ یہ تمام خزانہ اسے تمدن کی بدولت ہی ملا ہے۔ مدت ہوئی اس نے قادرِ مطلق اور عالمِ مطلق کے متعلق ایک بلند آدرش قائم کیا تھا جسے اس نے دیوتاؤں کا روپ دیا۔ اس کی خواہشات نے جو کچھ ناقابلِ تحصیل یا اپنے لئے ممنوع سمجھا ، ان دیوتاؤں سے منسوب کر دیا۔ اس لئے آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ دیوتا تمدن کے آدرش تھے۔ اب وہ اس مقام کے خاصا قریب پہنچ گیا ہے جہاں وہ اپنے آدرش کو حاصل کر سکتا ہے، بذاتِ خود تقریباً ایک دیوتا بن گیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ صرف اس صورت میں حسبِ معمول انسانیت کو اس کے آدرش مل جاتے ہیں، مکمل باتوں میں تو نہیں، کئی باتوں میں تو قطعاً نہیں کئی میں صرف نصف ہی۔ یوں تو آدمی مصنوعی اعضاء کی بدولت ایک قسم کا خدا بن گیا ہے جو زائد اعضاء سے آراستہ ہونے پر کافی شاندار دکھائی دیتا ہے لیکن وہ اس کے جسم پر نہیں اُگتے اور اس کے باوجود اسے کئی دفعہ تکلیف دیتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو اس خیال سے تشفی دینے کا حقدار ہوگا کہ اس عملِ ارتقا کا سنہ ۱۹۳۰ء[1] بعد ازیں خاتمہ نہیں ہو جائے گا۔ عالمِ تمدن میں آنے والی نسلیں اور بھی زیادہ ترقی کریں گی جو غالباً اس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں اور انسان کی کسی دیوتا سے مشابہت کو اور بھی زیادہ

---

[1] یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ (مترجم)

بڑھا دے گی۔ لیکن اپنی بحث کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج کل کا انسان، ایک دیوتا سے اپنی تمام مشابہت کے باوجود خوش نہیں ہے۔

اس طرح ہم یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایک ملک تب تہذیب کا بلند معیار حاصل کر لیتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جو آدمی کے لئے اور اسے قدرت سے بچانے کے لئے قدرتی ذرائع استعمال کرنے میں مدد دے سکتی ہے —— ہر چیز بالغرض جو اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے —— کی کاشت ہوتی ہے اور اس کی پوری طرح نگہداشت ہوتی ہے۔ اس قسم کے ملک میں ان دریاؤں کے رخ کو قابو میں رکھا جاتا ہے جن کا اپنے کناروں پر سے اوپر نکلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ان کے پانی کو نہروں کے ذریعہ ان جگہوں تک پہنچایا جاتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین کی نہایت محنت سے کاشت کی جاتی ہے اور اس میں موزوں چیزیں اگائی جاتی ہیں۔ معدنی دولت کو بھی بڑی جاں فشانی سے اس کی گہرائیوں سے کھود کر نکالا جاتا ہے اور اسے مطلوب اوزاروں اور ظروف میں ڈھالا جاتا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع تیز رفتار اور صحیح قسم کے ہیں۔ وحشی اور خوفناک جانوروں کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔ سدھائے ہوئے اور پالتو جانوروں کی نشو و نما ترقی پر ہے۔ لیکن ہمیں تہذیب سے کئی اور بھی چیزیں مطلوب ہیں اور حیرانی کی بات ہے کہ ہم نھیں ایسے ملکوں میں موجود پاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اپنے پہلے مطالب سے منکر ہونا چاہتے ہوں۔ ہم اس بات کو بھی تہذیب کے بلند معیار پر پہنچنے کا ثبوت

سمجھتے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باشندگان کی محنت و مشقت کو ایسے کاموں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یکساں طور پر قطعاً بیکار چیزوں جن کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور جو اس کے برعکس ایسی چیزوں میں صرف کیا جاتا ہے جو بظاہر فضول معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً جب شہر کے پارکوں اور باغات میں جو بحیثیت جولانگاہ اور ہوائی ذخیرے کے ضروری ہوتے ہیں، پھول لگے ہیں یا مکانوں کی کھڑکیوں کو پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ جب ہمیں اس بات کا فوراً پتہ چلتا ہے کہ وہ فضول چیز جو ہم تہذیب سے طلب کرتے ہیں حسن ہے، تو ہم مہذب لوگوں سے اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ قدرت میں جہاں کہیں بھی حسن پایا جائے وہ اس کی پرستش کریں اور جہاں تک ہو سکے اسے اپنی کاریگری میں بھی پیدا کریں لیکن اس سے وہ تمام مطالبات جو ہم تہذیب سے کرنا چاہتے ہیں ختم نہیں ہو جاتے۔ ہمیں صفائی اور قرینے کی علامات دیکھنے کی امید ہوتی ہے۔ شیکسپیر کے زمانے میں کسی دیہاتی شہر کے تمدنی معیار کے متعلق ہماری رائے یہ پڑھنے سے بلند نہیں ہو جاتی اگر سٹریٹ فورڈ میں اس کے باپ کے مکان کے سامنے گوبر کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہمیں اس بات پر نہایت غصہ آتا ہے اور ہم اسے جہالت کے نام سے پکارتے ہیں جب ہم تہذیب کے عین برعکس وینر والڈ کے رستوں میں کاغذ کا کوڑا پڑا دیکھتے ہیں۔ کسی قسم کی گندگی تہذیب سے بے میل معلوم ہوتی ہے۔ ہم صفائی کے لئے اس مطالبہ کو جسم تک پہنچا دیتے ہیں اور ہمیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ روئی سٹیبل کے جسم سے کتنی بدبو آتی تھی جب ہمیں آسولا بیلا میں ہاتھ دھونے کی ایک چھوٹی سی چلمچی دکھائی

جاتی ہے، جسے نپولین استعمال کیا کرتا تھا تو ہم سر دھنتے ہیں۔ بے شک ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا اگر کوئی شخص صابون کو تہذیب کی کسوٹی کے طور پر استعمال کرے۔ قرینہ، صفائی کی طرح انسان کی کلیتاً کاریگری سے متعلق ہے۔ لیکن اگر ہم قدرت سے صاف رہنے کی توقع نہیں رکھ سکتے تو اس کے برعکس تنظیم کی نقل ہم نے اسے دیکھ کر اتاری ہے۔ اجرام فلکی کی نقل و حرکت کے باقاعدہ اوقات کے انسانی مشاہدے نے اس کی اپنی زندگی کے لئے نہ صرف ایک مثال کا کام دیا بلکہ اس کی اپنی زندگی میں اسلوب کو دخل دینے کی کوشش کے لئے لائحہ عمل کا۔ باقاعدگی ایک قسم کا مجبوری دہراؤ (REPETITION COMPULSION) ہوتی ہے جس سے یہ ہمیشہ نافذ ہو جاتا ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ ایک کام کیوں اور کس طرح ایک ہی قسم کے موقعہ پر کیا جائے گا تاکہ آئندہ شک اور تامل سے گریز کیا جا سکے باقاعدگی کے فوائد کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ ہمیں اپنے علم کے مطابق وقت اور مکان کا سب سے فائدہ مند طریقہ بتاتی ہے اور ہم اس چیز کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اگر یہ شروع ہی سے کسی مخالفت کے بغیر تمام انسانی کاموں کا جزو بن گئی ہو اور یہاں آدمی واقعی یہ سوال پوچھتا ہے کہ آیا ایسا نہیں ہوا اور یہ کہ اس کے برعکس بنی نوع انسان لاپرواہی، بے قاعدگی اور اپنے کام کرنے میں ناقابل اعتماد ہونے کا ایک پیدائشی رجحان ظاہر کرتا ہے اور انھیں بڑی مشکل سے اجرام فلکی کی مثال کی نقل کرنے کی تربیت دینے کی ضرورت پڑتی ہے (حسن، صفائی اور باقاعدگی کو تہذیب کی ضروریات میں ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ وہ ز [illegible]

Prof. SHARIB RUDAULVI

وہ حرکات جن سے قدرتی طاقتوں کے ان عناصر کو قابو میں لانا مقصود ہوتا ہے۔ جن کا ہم نے ابھی ذکر کرنا ہے۔ اس کے باوجود کوئی انھیں جان بوجھ کر ہیچ سمجھتے ہوئے پس پشت نہیں ڈالے گا۔ حسن ایک مثال ہے جو صاف ظاہر کرتی ہے کہ تمدن اپنے مقاصد کے اعتبار سے صرف افادی ہی نہیں، کیونکہ عدم حسن ایک ایسی چیز ہے جسے ہم دور تہذیب میں برداشت نہیں کر سکتے باقاعدگی کے افادی حاصل بالکل عیاں ہیں۔ صفائی کے اعتبار سے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ حفظان صحت ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور ہم یہ قیاس لگا سکتے ہیں کہ سائنسی روک تھام کے طریقے اختیار کرنے سے پہلے بھی بنی نوع انسان کو اس میں کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ ان دونوں میں کوئی رشتہ موجود ہے لیکن تمدن کے ان مقاصد اور جد وجہد کو کلیتاً افادی لحاظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ کسی اور عنصر کا بالضرور عمل دخل ہے۔

باایں ہمہ، عام رائے کے مطابق ہمارے تمدن کا ایک اور ایسا ممتاز پہلو ہے جو اسے کسی دوسرے سے بہتر طور پر مستثنیٰ کرتا ہے اور یہ وہ اہمیت ہے جو یہ ذہنی اعمال کو دیتا ہے ——— عقلی، سائنسی اور جمالیاتی کارنامے ——— خیالات کو انسانی زندگی میں وہ مقدم جگہ جسے وہ تسلیم کرتا ہے۔ ان افکار میں مذہبی عقائد اور ان کے پیچیدہ ارتقا کو اول درجہ حاصل ہے، جس پر میں نے کسی اور ضمن میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد فلسفیانہ خیال آرائیاں ہیں اور آخر میں انسان کے قائم کردہ آدرش ——— انسان میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے امکان کا تصور، ان کی بنا پر ان کے مطالبات،

اس کی ذہنی تخلیقات ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت ملے جلے ہوتے ہیں، جو انھیں اور ان کی نفسیاتی وجوہ کو بیان کرنے کی کوشش کو مشکل بنا دیتا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ تمام انسانی افعال کے پیچھے فائدہ اور لذت کے دو اہم مرکز مقاصد حاصل کرنے کی جدوجہد کارفرما ہے تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ تمدن کے دوسرے مظاہر کے متعلق بھی صحیح ہے۔ حالانکہ سائنس اور آرٹ کے بارے میں ہی اس بات کو صحیح مانا جاتا ہے۔ تاہم اس بات کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ باقی ماندہ بھی انسان میں کسی اور زبردست ضرورت سے مشابہ ہے۔ شاید ایک ایسی جو صرف کم تعداد لوگوں میں ترقی کر گئی ہے۔ نہ ہی ہمیں ان مذہبی اور فلسفیانہ عقائد اور ان آدرشوں کے متعلق اپنی رائے کے زیر اثر بہک جانا چاہیئے، خواہ ہم انھیں انسانی دماغ کا بلند ترین کارنامہ سمجھیں یا انھیں مغالطہ سمجھ کر ان پر افسوس ظاہر کریں۔ آدمی کو یہ لازماً ماننا چاہیئے کہ وہ جہاں کہیں موجود ہیں اور بالخصوص جہاں وہ عروج پر ہیں، وہ تہذیب کا بلند معیار ہونے کا ثبوت ہیں۔

اب ہمیں ان میں سے آخری اور کسی صورت میں کم اہم نہیں، تمدنی عناصر میں سے ایک پر غور کرنا ہے یعنی وہ طریقے جن سے سماجی تعلقات، اور انسان کے ایک دوسرے سے تعلقات درست کئے جاتے ہیں۔ اس کی بحیثیت پڑوسی تمام متعلقہ چیزیں، ایک ذریعۂ مدد، دوسروں کے لئے خارجی جنسی چیز، کسی کنبے یا ریاست کا ایک رکن، اس معاملے میں کسی بہترین معیار کے مطابق غیر جانبدا

رہنا اور اس کی تصدیق کرنا کہ یہاں کون سی خاص چیز تمدنی ہے خصوصاً مشکل ہے۔ شاید کوئی اس رائے سے شروع کرے کہ ان اشتراکی تعلقات کو منظم کرنے کے لئے جو پہلا قدم اٹھایا گیا اس میں پہلے ہی سے تہذیب کا لازمی عنصر مضمر تھا۔ اگر اس قسم کا قدم نہ اُٹھایا جاتا تو یہ تعلقات انفرادی ارادے کے تابع رہیں گے۔ بالفاظ دیگر جو شخص جسمانی طور سے سب سے طاقتور ہوگا وہ اپنے مفاد اور خواہشات کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرے گا۔ صورتِ حال تو ایسی ہی رہے گی خواہ اس طاقت ور آدمی کی اپنی جگہ اپنے سے زیادہ طاقت ور سے ٹکر ہو جائے۔ کسی جماعت میں انسانی زندگی تب ہی ممکن ہو سکتی ہے جب متعدد لوگ متحد ہو کر اتنے طاقت ور ہو جائیں کہ وہ کسی فرد واحد سے برتر ہو جاتی ہے اور تمام الگ الگ لوگوں کے خلاف متحد رہتے ہیں۔ تب اس متحدہ طاقت کی جماعت، جسے کسی منفرد طاقت کے مقابلے میں ”حق“ کہتے ہیں۔ جس کی ”تند تشدد“ کی حیثیت میں مذمت کی جاتی ہے، انفرادی طاقت کو متحدہ طاقت کا قائم مقام مقرر کرنا تہذیب کی طرف پہلا فیصلہ کن قدم ہوتا ہے۔ اس کی اصلیت اس شرط میں مضمر ہے کہ ایک مخصوص جماعت کے اراکین نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے امکانات کو محدود کر دیا ہے جہاں بحیثیت منفرد آدمی ایسی پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس لئے تمدن کا پہلا مطالبہ انصاف ہے یعنی اس بات کی ضمانت کہ قانون کے ایک بار بن جانے کے بعد اُس کی کبھی کسی خاص شخص کے حق میں خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ اس سے اس قسم کے کسی قانون کا اخلاقی اہمیت رکھنا ثابت نہیں ہوتا۔ تمدنی

ارتقاء کا مزید رُخ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قانون اب کسی مختصر سے گروہ کی مرضی کا آئینہ دار نہیں رہے گا ـــــ ذات، قوم، آبادی کا ایک حصہ ـــــ جو ایک لٹیرے کی طرح اس قسم کے گروہ کے ساتھ ہو جس کی تعداد شاید زیادہ ہو، سلوک کرے ـــــ اس کا آخری انجام قانون کی اسی قسم کی حالت ہوگی جس کے ـــــ یعنی وہ سب جو متحد ہونے کے قابل ہیں پیدا کرنے میں سب نے اپنی خواہشات کی کچھ نہ کچھ قربانی دی ہے اور جو کسی کو ـــــ دوبارہ اس کے سوا ـــــ تند تشدد کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتا۔

انفرادی آزادی تمدن کی طرح فائدہ مند نہیں ہے، یہ کسی تمدن سے پہلے بدرجۂ اتم موجود تھی۔ حالانکہ اس کی اس وقت کچھ اہمیت نہ تھی کیونکہ فرد اس حیثیت میں نہ تھا کہ اس کی حفاظت کر سکے۔ ارتقاءِ تہذیب کے ذریعہ آزادی پر کئی پابندیاں لگائی گئی ہیں اور انصاف اس کا طلب گار ہے کہ یہ پابندیاں سب پر عائد ہوں۔ آزادی کے لئے تمنا جس کی موجودگی کا احساس ایک جماعت میں پیدا ہو جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی موجودہ ناانصافی کے خلاف بغاوت ہو اور نتیجتاً تہذیب کے مزید ارتقاء کے لئے شاید موافق ثابت ہو اور اس کے مطابق رہے لیکن اس کی ابتدا شخصیت کی قدیم جڑوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ جو اب تک تہذیب کی زنجیروں میں جکڑی گئی، اور یوں تمدن سے مخالفت کا باعث ہے، چنانچہ آزادی کے لئے پکار یا تو تمدن کی مخصوص اشکال یا مطالبات یا بذات خود تمدن کے خلاف بلند کی جاتی ہے ـــــ

ایسا تو ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ کسی اثر کے ماتحت آدمی کی فطرت کو کیڑوں مکوڑوں

کی فطرت میں تبدیل کیا جا سکے۔ ہمارا یہ خیال کہ وہ ہمیشہ اکثریت کی مرضی کے مقابلے میں اپنی شخصی آزادی کی حفاظت کرے گا، انسانیت کی جدوجہد کا بیشتر حصہ کوئی موزوں قسم کے سمجھوتہ (یعنی پورا کرنا) کرانے کے کام پر مرکوز ہے یہ سوال انسان کی قسمت کے مسائل میں سے ایک ہے کہ آیا تمدن کی کسی صورت میں یہ حل ہو سکتا ہے یا یہ باہمی کشمکش ناقابل سمجھوتہ رہے گی۔

اس عام نظریے کو قبول کر کے کہ انسانی زندگی کے کون سے پہلو تمدن کہلانے کے قابل ہیں، ہم نے تمدن کی پیش کردہ تصویر کے مجموعی تاثرات حاصل کئے ہیں لیکن یہ درست ہے کہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم نے کوئی ایسی نئی چیز دریافت نہیں کی جو عام لوگوں کو معلوم نہ ہو۔ تاہم ہم نے اس موقع پر اپنے آپ کو اس غلط فہمی سے بچانے کی کوشش کی ہے کہ تہذیب کامل بننے کے مترادف ہے، ایک ایسا راستہ ہے جس سے آدمی کا کامل بننا لازم ہے لیکن یہاں ایک اور نظریہ غور طلب ہے۔ یہ غالباً ہمیں کسی اور طرف لے جائے گا۔ ارتقار تمدن ہمیں ایک عجیب قسم کا سوال معلوم ہوتا ہے جس میں سے انسانیت گذری ہے جس کے کئی پہلو ہمیں جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس عمل کی ان تبدیلیوں کے معنی بھی بیان کریں گے جو یہ انسان کے جانے ہوئے جبلی رجحانات میں پیدا کرے گا اور جس کی تشفی کرنا ہماری زندگی کے تنظیمی پہلو سے متعلق ہے ان میں کئی جبلی افعال، اگر ایسا کیا جا سکے، اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ نتیجتاً ان کی جگہ ایک ایسی چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم ایک شخص کا جزو کردار کہتے

ہیں۔ اس عمل کی سب سے حیرت انگیز مثال نوجوان کی لذتِ کون ہے (ANALEROTICISM) ان کی پہلی دلچسپی اخراج غلاظت کا کام ہے۔ اس کے اعضا اور ان کی پیداوار، جوان کی بالیدگی کے دوران میں خصائل کے گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جنھیں ہم بخوبی جانتے ہیں ——— بخیلی، باقاعدگی اور صفائی پسندی۔ جو بذاتِ خود قابل قدر اور خوش آیند خصلتیں ہیں جنھیں بایں ہمہ شدید بنایا جا سکتا ہے، حتی کہ وہ ظاہراً شخصیت پر چھا جاتی ہیں۔ اور کردارِ کون (ANAL CLHARCTER) پر منتج ہوتی ہیں۔ یہ کس طرح ہوتا ہے ہم نہیں جانتے لیکن اس نتیجے کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں گذرتا[1]۔ اب ہم نے دیکھا ہے کہ باقاعدگی، صفائی پسندی دراصل تمدنی مطالبات ہیں۔ حالانکہ ان کی پسماندگی کے لئے ضرورت خاص طور پر عیاں نہیں ہے اس سے زیادہ نہیں کہ وہ باعثِ لذت ہو۔ اس مقام پر ہم تمدنی ترقی اور قوت جنسی کی بالیدگی کی آپس میں مشابہت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ دوسرے جبلی افعال کو اپنی آسودگی کے حالات تبدیل کرنے کے لئے رضامند کرنا پڑتا ہے۔ انھیں دوسرے راستوں سے حاصل کرنا، ایک ایسا عمل جو عموماً اس کا ہمجلس ہوتا ہے، جسے ہم ترفع (جبلی فعل) کے نام سے پکارتے ہیں لیکن جسے کبھی کبھی اس سے امتیاز کرتے ہیں۔ ارتفاع جبلی تمدنی

---

[1] C.F. HLARACTER AND ANAL EROTICISM (1918), COLLECTED VOL. II ALSONUMEROUS CONTRIBUTIONS TO THE SUBTJECT BY ERNEST JONES AND OTHERS PAPERS

ارتقا رکا ایک مخصوص نشان ہے۔ یہی تو ہے جو اعلیٰ ذہنی اعمال، سائنس، آرٹ سے متعلق متخیلہ حرکات کا زندگی میں حصہ لینا ممکن بنا دیتا ہے۔ اگر آدمی پہلے تاثر سے ہی مرعوب ہو جائے تو ہم کو یہ بات کہنے کو جی چاہے گا کہ ارتفاع ایک ایسی قسمت ہے جسے اکیلے تمدن نے آدمی پر ٹھونس دیا ہے۔ لیکن اس پر تھوڑا سا اور غور کرنا بہتر ہوگا۔ تیسرا اور آخری، اور یہ نکتہ جو سب سے اہم ترین معلوم ہوتا ہے، وہ حد ہے جس تک تہذیب جبلت کی ترک تکمیل پر مبنی ہے۔ وہ حد جس تک تہذیب کی بقا کے لئے پرزور جبلی ضروریات کا ناکام رکھنا (دبانا)، بھول جانا یا کچھ اور) ایک شرط ہے۔ یہ تمدنی محرومی اس کے مابین سب تعلقات پر مسلط ہوتی ہے۔ ہم یہ پہلے ہی جانتے ہیں کہ یہ اس دشمنی کی وجہ ہے جس کے خلاف ساری تہذیب کو لڑنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارے سائنسی قانون میں بھی بڑی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ ہم نے اس جگہ بہت کچھ واضح کرنا ہے۔ یہ سمجھنا آسان نہیں کہ ایک جبلی فعل کی تکمیل سے احتراز کرنا ناممکن ہے، نہ ہی یہ کسی خطرے سے خالی ہے۔ اگر محرومی کی تنظیمی اعتبار سے تلافی نہ کی جائے تو آدمی کا شدید بیماریاں پیدا کرنا یقینی امر ہو جائے گا۔

لیکن اب اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ہمارے تمدن کی بالیدگی کو ایک خاص عمل کیوں سمجھنا چاہیے، جو کسی فرد کے نارمل بلوغت حاصل کرنے کے مشابہ ہے تو ہمیں ایک اور مسئلہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ وہ کون سے ایسے اثرات ہیں جن کا تمدن پیداوار ہے۔ یہ کس طرح رونما ہوا۔ اس کی روش کا کس نے فیصلہ کیا؟

۴

یہاں اپنی کم مایگی کا اعتراف کرنے کا کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ اس کے متعلق میں نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔ جب قدیم انسان نے ایک بار دریافت کرلیا کہ — معنوی اعتبار سے — دھرتی پر کام کر کے اپنی حالت بہتر بنانا اس کے بس کی بات نہ تھی، یہ بات اس کے لئے دلچسپ ثابت نہ ہوئی نہ ہوئی ہوگی کہ آیا کوئی اور شخص اس کا کام کرتا تھا یا اس کے خلاف تھا۔ موخرالذکر نے رفیق کار کا درجہ حاصل کرلیا اور اس کے ساتھ رہنا فائدہ مند تھا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی اپنے بندر نما (APE-LIKE) قبل از تاریخ ارتقا میں، آدمی کنبہ بنانے کا عادی ہوگیا تھا۔ یہاں آدمی یہ مان سکتا ہے کہ کنبوں کا قیام ایک لحاظ سے اس دور سے متعلق تھا جب جنسی آسودگی، جو اب اس اتفاقیہ مہمان کی طرح نہ تھی جو آناً فاناً نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے، اور بعد ازاں مدت تک اپنی کوئی خبر

نہیں دیتا، ہر شخص کے ساتھ مستقل مکین کی طرح سکونت پذیر ہو گئی۔ جب ایسا ہوا تو مرد کو عورت، بلکہ اپنی جنسی خارجی چیزوں کو اپنے قریب رکھنے کی ضرورت پیدا ہو گئی، اس اثنا میں عورت، جو کبھی اپنے بے بس بچے سے الگ ہونا گوارا نہیں کر سکتی تھی، کو اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر زیادہ طاقت ور کے ساتھ رہنا پڑا۔[1]

---

[1] یہ سچ ہے کہ جنسی عمل کی عضوی معیادی نمود قائم رہی ہے لیکن اس کا ذہنی ہیجان پر الٹا اثر پڑ گیا ہے۔ اس تبدیلی کا بنیادی تعلق قوتِ شامہ کی اہمیت کم ہونے سے ہے، جس کے ذریعے عمل حیض مرد کا ذہن برانگیخت کر دیتا تھا۔ اس کا کام نظری محرک نے کرنا شروع کر دیا، جو مستقل طور پر قوتِ شامہ کی مانند برسرِ کار رہ سکتا تھا۔ بے قاعدہ نیچ کی بجائے "امتناع حیض" کی ابتدا، اس عضوی بھول (ORGANIC REPRESSION) سے ہوئی ہے۔ جس نے نشوونما کی اس منزل کے خلاف سرحد کا کام دیا جسے پار کر لیا گیا تھا

(C.F.C.D.DALY, HINDU MYTHSLIGIE AND KASTRATIONSIK'OMRI6K IMAGO, BD. XIII, 1927)

جب کسی گذشتہ تمدنی دور کے دیوتاؤں کو اگلے دور میں بھوت پریت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو یہ عمل کسی مختلف سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ قوتِ شامہ کے محرکات میں تخفیف بذاتِ خود انسان کے زمین پر سے کھڑے ہونے اور سیدھا ہو کر چلنے کا نتیجہ ہے۔ اس نے اس کے عضو تناسل کو، جو پہلے مستور تھا، اب ننگا کر دیا۔ اور انھیں بچائے رکھنے کی ضرورت پیدا کر دی اور اس طرح احساس شرم پیدا کر دیا۔ انسان کا اس لئے سیدھا کھڑا ہونا تمدنی ارتقاء کے عمل عظیم میں سنگ میل کی ابتدا ظاہر کرتا ہے۔ اس سے آگے ترقی کی کڑی قوت شامہ کے ہیجانات کی اہمیت میں کمی اور عورت کو ایام حیض میں اس وقت تک علیحدہ رکھنے تک جب نظری محرک مقدم بن گئے اعضاء تناسل آشکار رہ گئے، حتیٰ کہ انسان کا جنسی اشتعال مستقل ہو گیا۔ اور کنبہ کی بنیاد پڑ گئی اور یوں انسانی تمدن کی دہلیز کی طرف عمل ارتقا بڑھتا گیا۔ یہ صرف قیاس آرائی ہے لیکن یہ اس قابل معلوم ہوتا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ٦١ پر)

اس قدیم کنبہ میں ایک تمدنی عنصر کی کمی ہے۔ باپ، اس کے سربراہ، کی لامحدود رضا۔ میں نے TOTEM AND TABU میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اس گھریلو زندگی سے بھائیوں کے متحد ہو جانے کے بعد کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا۔ باپ پر غلبہ پاکر اس کے لڑکوں نے یہ معلوم کرلیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٠) کہ اس کا بڑی احتیاط سے ان جانوروں کے حالات سے مقابلہ کرلیا جائے جو انسان سے ملتے جلتے ہیں۔

تہذیب کی صفائی پسندانہ خواہش پیدا ہو جانے میں ایک واضح سماجی عنصر بروئے کار ہے جس کا بعد ازاں علم حفظانِ صحت کی بنا پر عذر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اپنی اہمیت دیکھے جانے سے پہلے بھی نمودار ہو گئی تھی۔ صفائی پسندی کے ہیجان کی ابتدا ان غلاظتوں کو دور کرنے کی کوشش سے ہوئی ہے جو احساسات لمس کے لئے ناگوار بن جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بچہ کھیل گھر (NURSEY) میں حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بچوں میں مخارج مادہ کسی قسم کی قوت پیدا نہیں کرتا، کیونکہ وہ اس کے جسم کا وہ حصہ ہیں جو اس سے علیحدہ کر دئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے بچوں کی تربیت نہایت پر زور ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اس کی آئندہ زندگی کو جلدی جلدی ختم کرنا ہوتا ہے جس کے مطابق یہ مخارج مادہ اس کے لئے فضول، قابل نفرت، خوفناک اور قابل حقارت بن جانا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو کہ جسم سے ان مخارج مادوں کا انجام ایسا ہی ہوا ہے جو انسان کے زمین پر سے کھڑے ہو کر چلنے کے بعد قوتِ شامہ کا ہوا تو قدروں میں یہ تبدیلی لائی ناممکن ہو جاتی۔ لذت مقعد (ANAL EROTICISM) اس لئے شروع ہی سے عضوی بھول (ORGANIC REPRESSION) کے زیر اثر لائی جاتی ہے۔ جو تمدن کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

وہ سماجی عنصر جو لذت مقعد کی مزید تبدیلیوں میں کارفرما رہا ہے انسان نے ساری ارتقائی ترقی کے باوجود اس جگہ نمودار ہوتا ہے جب اسے اپنے مخارج مادہ کی بدبو اب تک شاذ ہی بری معلوم ہوتی ہے گو دوسروں کی غلاظت ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ وہ شخص جو صاف نہیں ہوتا جو اپنی غلاظت کو خارج نہیں کرتا اس لئے دوسروں کو ناخوش کرتا ہے، ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ایک ایسی حقیقت جو عام ترین اور انتہائی سخت قسم کی گالیوں سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ناقابل فہم ہے کہ آدمی بطور گالی عالمِ حیوانات ہی سے اپنے ایک باوفا دوست کا نام لے۔ اگر کتے اپنے دو خصائل کی وجہ سے آدمی میں نفرت پیدا نہ کریں۔ اس لئے کہ وہ بدبودار جانور ہیں اور اپنے مخارج مادہ سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ دوم اس لئے کہ انہیں اپنے جنسی افعال سے شرم نہیں آتی۔

کہ اگر بہت سے لوگ متحد ہو جائیں تو وہ ایک آدمی سے زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں۔ تمدن کا دورِ نشان پرستی (TOTEMISTIC) ان پابندیوں پر مبنی تھا جو متذکرہ گروہ ایک دوسرے پر عائد کرنے پر ا"نا مجبور ہو گیا تھا تاکہ وہ نظام نو کو برقرار رکھ سکے۔ یہ ممنوعات پہلے "حق یا قانون" تھے۔ آدمی کی مشترکہ زندگی کی دو رُخی بنیاد تھی۔ خارجی ضرورت کی وجہ سے کام کرنے کی مجبوری اور محبت کی طاقت جس سے وہ اپنی جنسی شے، عورت، اور عورت کو اس کے جسم کا وہ حصہ جو اُس نے کھو دیا ہے، بچہ، کو اپنے قریب رکھنے کا باعث بنے۔ کام دیو (EROS) اور (ANANKE) بھی انسانی تمدن کے ماں باپ تھے۔ تمدن کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ تب لوگوں کی زیادہ تر تعداد اکٹھی رہ سکتی تھی۔ اور کیونکہ یہ دو زبردست طاقتیں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی تھیں۔ آدمی کو شاید یہ خیال ہو کہ مزید تمدنی ارتقا کی بیرونی دنیا پر قابو پانے کی طرف ترقی نہایت آسانی سے جاری رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ ان آدمیوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا جو زندگی میں مل کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ سمجھنا آسان نہیں کہ اس تمدن کو کس طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ یہ صرف ان کے لئے باعثِ تشفی ہے جو اس میں شریک ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم یہ پوچھنے جائیں کہ اس کے ہیجانات کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ ہم اس نکتہ سے ہٹ جائیں گے کہ محبت اس کے بانیوں میں سے ایک تھی اور یوں ہماری گذشتہ بحثوں میں جو خلا رہ گیا تھا وہ پورا ہو جائے گا۔ ہم نے کہا تھا کہ انسان نے تجربہ کی رو سے یہ دریافت

کرنے کے بعد کہ عضوِ تناسل سے متعلقہ جنسی محبت اسے عظیم ترین تسکین دیتی تھی حتیٰ کہ یہ اس کے لیے تمام تر خوشی کا نمونہ بن گئی۔ پھر انسان عضوِ تناسل کو اپنے مقصدِ حیات کا محور بنانے اور جنسی تعلقات کے ذریعہ اپنی مسرت تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ہم نے اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا کرنے میں وہ کافی خوفناک حد تک بیرونی دنیا کا محتاج ہو جاتا ہے یعنی کہ اگر اس کا منتخب محبوب اسے مسترد کر دے یا اس کے مرنے یا اسے چھوڑ جانے کی وجہ سے اُس کی محبت کھو دے۔ چنانچہ ہر زمانے میں دانشوروں نے بڑے پرزور الفاظ میں اس قسم کی زندگی سے خبردار کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگوں کی کثیر تعداد کے لئے باعث دلچسپی ثابت ہوتا ہے۔

بایں ہمہ لوگوں کی تھوڑی سی تعداد کو اپنی ساخت کی بنا پر اس طرزِ محبت سے شادمانی حاصل ہوتی ہے لیکن اسے ممکن بنانے کے لئے شہوانی فعل میں ذہنی تبدیلیاں پیدا کرنا ضروری ہیں۔ یہ لوگ اپنے محبوب کی رضامندی سے یوں بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ بنیادی کشش کو محبت کرنے کی بجائے محبت کروانے کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے کھو جانے کے خطرے سے اس طرح بچاتے ہیں کہ وہ جذبۂ محبت کو منفرد اشخاص سے وابستہ نہیں کرتے بلکہ یکساں طور پر سب سے، اور وہ جنسی محبت کی بے ثباتی اور مایوسیوں کے مقصد سے منحرف ہو کر اور اُس کے جبلی فعل کو رکے ہوئے (INHIBITED) مقصد میں تبدیل کر کے دور کر دیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے وہ اپنے اندر جو کیفیت پیدا کر لیتے ہیں ـــ ایک غیر مبدل، غیر منحرف اور پُر رحم لگاؤ ہے۔ ـــ عضوِ تناسل

سے متعلق اس کی جنسی محبت میں طوفان خیز انقلابات سے کوئی مشابہت نہیں ہوتی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسیسی کی سینٹ فرانسس محبت کرنے کے اس طریقے کو داخلی لذت پیدا کرنے کے لیے اس حد تک لے گئی جہاں تک کہ لوگ لے گئے تھے یوں ہم ان طریقوں میں سے ایک کو، جن سے قانون لذت پرستی اپنی تشفی کرتا ہے مستثنیٰ کر دیتے ہیں۔ جن کو در اصل بہت سی باتوں میں مذہب سے منسلک کیا گیا ہے۔ ان کے درمیان تعلق شاید ذہن کے دور افتادہ قلعوں جیسا ہو سکتا ہے۔ جہاں انا اور خارجی چیزوں میں افتراق ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک اخلاقی نقطۂ نگاہ سے جس کے گہرے محرک کا بعد میں واضح طور پر پتہ چل جائے گا۔ عام دنیا کیلئے ہمہ گیر محبت کرنے کا یہ رجحان ذہن کی وہ بلند ترین کیفیت سمجھا دیتا ہے جس کا انسان اہل ہے۔ اس بحث کی ابتدا میں ہی دو اعتراضات کرنے سے نہیں رکوں گا ایسی محبت جو ناقابل اختیار ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے کیونکہ وہ اپنے "محبوب" سے ناانصافی کرتی ہے، دوم سب لوگ محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

وہ محبت جس نے کنبے کی بنیاد رکھی۔ اس کی طاقت اب تک بچی ہوئی ہے، اپنی اصل صورت میں یہ براہ راست جنسی آسودگی سے کم اور کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی اور اپنی مبدل شکل میں یہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے جکڑنے کا کام کرتی ہے اور یہ اس کام کو اتنی شدت سے سرانجام دیتی ہے۔ بہ نسبت اس کام کے جس میں مشترکہ دلچسپی لی جاتی ہے۔ وہ سرسری اور مخصوص انداز جس میں لفظ "محبت" کا زبان میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا ابتدائی جواز ہے

عام استعمال میں آدمی اور عورت کے درمیان اس تعلق کو محبت کہا جاتا ہے جن کی جنسی خواہشات اُن کے "گھر" بسانے پر منتج ہوتی ہیں لیکن گھر میں والدین اور اولاد، بھائیوں اور بہنوں کے درمیان ایسے رشتے کو بھی محبت کہا جاتا ہے، گو ہمیں مقصد کے اعتبار سے، اُسے رُکی ہوئی محبت یا انس کہنا چاہیے۔

دراصل رُکے ہوئے مقصد کی محبت مکمل شہوانی محبت تھی اور لوگوں کے تحت الشعور میں اب تک ویسی ہی ہے۔ شہوانی اور رُکے ہوئے مقصد کی دونوں صورتیں گھر کی چار دیواری پار کر جاتی ہیں اور ان لوگوں کے درمیان نئے بندھن پیدا کر دیتی ہیں جو پہلے اجنبی تھے۔ عضوِ تناسل سے متعلق محبت سے نئے کنبوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ رُکے ہوئے مقصد کی محبت دوستی کی بنیاد رکھتی ہے جو تمدنی اعتبار سے اس کے قابل قدر ہیں کیونکہ وہ عضوِ تناسل سے متعلقہ محبت پر کئی پابندیاں عائد نہیں کرتے، مثلاً اس کی علیحدگی لیکن ترقی کی رفتار بڑھنے کے ساتھ ساتھ محبت اور تمدن میں آپس کے تعلقات اپنی سادگی کھو بیٹھتے تھے۔ ایک طرف تو محبت تمدنی مفاد کی مخالفت کرتی ہے اور دوسری طرف تمدن محبت کو نقصان دہ پابندیوں کی دھمکی دیتا ہے۔ ان میں تشگاف پیدا ہونا اٹل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کا فوراً پتہ نہیں چلتا۔ پہلے تو یہ کنبہ اور اُس سے زیادہ بڑی جماعت، جس کا فرد ایک رکن ہے، کے درمیان ٹکر سے شروع ہوتا ہے، ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے کہ تمدن کی نمایاں ترین کوششوں کا مقصد مرد اور عورت کو زیادہ بڑے گروہوں میں ایک دوسرے سے ملانا ہوتا ہے لیکن کنبہ فرد کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کے اراکین میں جتنی زیادہ باہمی وابستگی ہوگی

وہ ایک دوسرے سے اتنا ہی زیادہ دور رہنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور عام دنیا کے وسیع تر دائرے میں داخل ہونا اتنا ہی زیادہ مشکل پاتے ہیں۔ زندگی کی وہ قسم جو نسلی ارتقا کے لحاظ سے زیادہ پرانی ہے اور جس کی عہد طفلی میں صورت ملتی ہے اس قسم میں تبدیل ہونے کا مطالبہ کرتی ہے جو وہ بعد ازاں تمدنی اعتبار سے حاصل کر لیتی ہے۔ گھر سے الگ ہونا ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جو ہر نوجوان کو درپیش ہوتا ہے اور ابتدائی رسوم INITIATION RITES کے ذریعہ اسے عبور کرنے میں سماج عام طور پر اس کی مدد کرتا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مشکلات جو ذہنی عمل کا جزو لاینفک ہوتی ہیں اور بنیاداً بے شک، ہر جاندار وجود کی بھی ہیں۔

دوسرا جھگڑا عورتوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو جلد ہی تمدنی رجحانات کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ اور اپنے گرد و پیش اپنا رجعت پسند اثر پھیلاتی ہیں۔ عورتیں یا کنبوں نے شروع میں اپنی محبت کی کشش سے تمدن کی داغ بیل ڈالی عورتیں جنسی زندگی اور کنبے کے مفاد کی علمبردار ہوتی ہیں۔ تہذیب کا کام زیادہ سے زیادہ مردوں کو سونپ دیا گیا ہے۔ یہ اسے ہمیشہ سخت سے سخت کام دیتی ہے اُسے ارتفاع جبلی حاصل کرنے مجبور کرتی ہے۔ عورت اسے آسانی سے نہیں کر سکتی۔ کیونکہ انسان لامحدود قوتِ جنس رکھتا ہے اس لئے اسے اس طرح تقسیم کرنا چاہیئے جس سے وہ سارے کام بطریق احسن کر سکے، وہ جنسی قوت کو تمدنی مقاصد حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اسے بہت حد تک اپنی جنسی زندگی سے ہٹا لیتا ہے۔ اس کا آدمیوں سے متواتر میل جول اور ان سے تعلقات

پر انحصار، اس کی شوہر اور باپ کی حیثیت میں ذمہ داریوں سے گریز کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح عورت تمدنی مطالبات کی وجہ سے اپنے آپ کو پس پشت میں دھکیلا ہوا پاتی ہے۔ اس لئے وہ مرد کی طرف مخالفانہ رویہ اختیار کر لیتی ہے۔

تمدن کا جنسی زندگی پر پابندیاں عائد کرنے کا رجحان اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کے دوسرے مقصد سے کم واضح نہیں ہے بلکہ اس کا اول ترین مرحلہ نشان پرستی، اپنے پیچھے زناکاری میں انتخاب خویش و اقارب پر پابندیوں کا ایک سلسلہ چھوڑ گیا، جو انسان کی شہوانی زندگی پر ایسا شدید ترین لنگڑا کرنے والا زخم لگا گیا جس کا کسی زمانے میں جواب نہیں ملتا تھا۔ ممنوعات اس پر مزید پابندیاں (TABOOS) لگا دیتے ہیں۔ قانون اور رواج جو مرد اور عورت دونوں پر عائد ہوتے ہیں مختلف تمدنوں میں ان کی حدِ استعمال بھی مختلف ہوگی، اور سماج کی اقتصادی ساخت بھی باقی ماندہ جنسی آزادی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایسی پابندیاں وضع کرنے میں تمدن تنظیمی نفسیاتی ضرورت کے قانون پر چلتا ہے اس لئے کہ ذہنی طاقت کا بیشتر حصہ جو اسے درکار ہوتا ہے وہ اسے جنسی زندگی میں سے وضع کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے جنسی زندگی کے متعلق تمدن کا نظریہ ایسا ہوتا ہے جو اس قوم یا آبادی کے بیشتر حصے کی طرح ہے جو غالب آگیا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی حق تلفی کرتا ہو، تب مظلوموں کی طرف سے بغاوت کا خطرہ نظم و نسق کو تہ و بالا کرنے کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اس معاملے میں اس قسم کی ترقی کو ہماری مغربی تہذیب میں خاصا اونچا مقام مل چکا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بچوں کی نفسیاتی زندگی کے کسی قسم کے اظہار کی مذمت

شروع کرنے کا اسے پورا حق پہنچتا ہے کیونکہ بالغوں کی جنسی زندگی کے انسداد کرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی، اگر بچپن میں اس کی تیاری نہ کی جائے۔ بایں ہمہ ان حدود کا اس سے زیادہ پار کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ جن تک مہذب سماج درحقیقت ان مظاہر سے انکار کرتا ہے۔ جو نہ صرف قابل ثبوت ہیں بلکہ اثباتی طور پر صاف ظاہر بھی۔ جہاں تک جنسی اعتبار سے بالغ آدمیوں کا تعلق ہے۔ محبوب کا انتخاب مقابل جنس تک اور بھی زیادہ محدود ہو جاتا ہے اور جنسی آسودگی کے غیر معمولی طریقوں کو بحیثیت انحرافات (PERVERSION) ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ ان ممنوعات میں جو اصول روز روشن کی طرح عیاں ہے وہ سب کے لئے ایک قسم کی جنسی زندگی عائد کرتا ہے۔ یہ انفرادی پیدائشی اور اکتسابی جنسی اختلافات کو پیش نظر نہیں رکھتا اور لوگوں کی بہت سی تعداد کو جنسی لذت حاصل کرنے سے محروم کر دیتا ہے جس کے باعث وہ انتہائی ناانصافی کا باعث بن جاتا ہے۔ ان پابندیوں کا نتیجہ شاید یہ ہو کہ یہ ان سب لوگوں کی جنسی دلچسپی جو نارمل ہیں جسمانی نقائص کے باعث معذور نہیں مزید حق تلفی کئے بغیر ان ذرائع سے ظاہر ہو سکیں گے۔ جو ان کے لئے کھلے ہیں لیکن وہ واحد راستہ جو یوں معتوب نہیں ہوتا ہے۔ مقابل سے جنسی تعلقات حلال زادگی اور واحد مناکحت کی پابندیوں کے ذریعہ محدود کر دیا گیا ہے۔ موجودہ تہذیب تو ہمیں صاف طور پر بتاتی ہے کہ عورت اور مرد کے آپس میں جنسی تعلقات رکھنے کی صرف اس صورت میں اجازت دی جا سکتی ہے اگر ان کا آپس میں بندھن پائدار اور قطعی ہو۔ اسے جنسیت فی نفسہ محض ذریعۂ لذت منظور نہیں۔ اور

یہ اسے اس نیت سے برداشت کرتی ہے، کیونکہ اب تک نسل انسانی کی افزائش کے لئے اسے اور کوئی بدل نہیں ملا۔

یہ بے شک ایک انتہا پسندی ظاہر کرتا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عملاً قلیل عرصے کے لئے بھی ناممکن ہے۔ صرف کمزور قسم کے لوگوں ہی نے اپنی جنسی آزادی میں اس قسم کی کھلم کھلا مداخلت قبول کرلی ہے اور زیادہ طاقتور قسم کے لوگوں نے صرف ایک تلافی کی صورت میں، جس کا شاید آگے چل کر ذکر کیا جائے۔ مہذب سماج نے اپنے آپ کو ایسی بہت سی خلاف ورزیوں کو خاموشی سے درگذر کرنے پر مجبور پایا ہے جن کو وہ اپنے ہی ضابطے کی رو سے سزاوار ٹھہرا سکتا تھا۔ بایں ہمہ یہ کسی دوسرے نظریہ کی طرف جھکنے اور یہ فرض کرنے کا حق نہیں دیتا کہ یہ اپنی منزل مقصود حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے سماج کا یہ رویہ قطعاً بے ضرر ہے ہم خواہ کچھ کہیں مہذب انسان کی جنسی زندگی بڑی بری طرح سے ناکارہ ہوگئی ہے۔ کئی دفعہ تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی حرکت ہے جو استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہونے کے مرحلے میں سے گذر رہی ہے، ہمارے دانتوں اور بالوں کی مانند۔ غالباً یہ خیال کرنا درست ہے کہ لذت بخش احساسات کا ذریعہ ہونے کی حیثیت میں۔ زندگی کا ذریعہ تکمیل۔ جنسیت کی اہمیت واضح طور پر کم ہوگئی ہے[1]۔ آدمی کئی دفعہ خیال کرتا ہے کہ یہ تمدنی تشدد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس فعل

---

[1] ایک حساس انگریز مصنف جان گالزوردی نے ایک افسانہ لکھا ہے جو مدت ہوئی مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اس کا نام THE APPIETREE (سیب کا درخت) ہے موصوف کو آج کل سب جانتے ہیں۔ اس افسانے میں اس نے نہایت ہی موثر اور پردرد انداز میں دکھایا ہے کہ موجودہ تہذیب میں سادہ اور فطری محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

میں بذاتِ خود کسی عنصر کی وجہ سے ہوتا ہے جو ہمیں پوری تسکین دینے سے انکار کرتا ہے اور دوسری طرف دھکیلتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ غلط ہو، اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔[1]

---

[1] مندرجہ ذیل نکات متذکرہ نظریئے کو ثابت کرنے میں مدد دیں گے۔ انسان بھی ایک ایسا حیوان ہے جس میں صریحی دوجنسی (BISEXUAL) میلانِ طبع پایا جاتا ہے۔ ایک فردِ بشر دو متناسب حصوں کا امتزاج ظاہر کرتا ہے جن میں ماہرین کی رائے کے مطابق ایک تو نر ہے اور دوسرا مادہ یہ بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ ہر نصف حصہ ابتداً ہیجڑا تھا۔ جنس ایک حیاتیاتی (BIOLOGICAL) حقیقت ہے جس کا نفسیاتی اندازہ لگانا مشکل ہے حالانکہ ذہنی زندگی میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ہم یہ کہنے کے عادی ہیں کہ انسان میں مردانہ اور زنانہ دونوں جبلی ضروریات اور خصائل پائے جاتے ہیں لیکن اس کی خصوصیات جن کو مردانہ اور زنانہ کہا جاتا ہے نفسیات سے نہیں بلکہ علم تشریحِ جسم کی رو سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے جنس کا مقابل سرگرمی (ACTIVITY) اور انفعالیت (PASSIVITY) میں معدوم ہو جاتا ہے اور ہم بڑی مستعدی سے حرکت کو مردانگی اور انفعالیت کو زنانہ پن کے مترادف سمجھتے ہیں۔ حیوانی دنیا میں اس کا ہمہ گیر ثبوت نہیں ملتا۔ نظریۂ دوجنسی اب تک بڑا مبہم سا ہے۔ اور تجزیۂ نفس میں اپنی کم مائگی معلوم کر کے بہت دکھ ہوتا رہے گا جب تک اس کا جبلی افعال سے رشتہ قائم نہیں ہو جاتا۔ بہرحال اگر ہم اس بات کو ایک حقیقی امر تسلیم کر لیں تو ہمیں ہر فردِ بشر کی جنسی زندگی میں مردانہ اور زنانہ خواہشات کے پورا کرنے کی ضرورت موجود ہوتی ہے تو اس امرِ ممکن کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ یہ دونوں ضروریات ایک ہی ذریعہ سے پوری نہیں ہو سکیں گی اور اگر انھیں اس طرح ایک دوسرے سے الگ نہ رکھا جائے تاکہ ہر تہیج اپنے لئے موزوں ذریعہ سے خارج ہو سکے اور وہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل انداز نہ ہوں۔ اس حقیقت سے ایک اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بسا اوقات فطری ایذا پسند جز کے علاوہ براہِ راست جذبۂ حملہ آوری شہوانی تعلقات سے وابستہ ہو جاتی ہے محبوب ہمیشہ اس قسم کی پیچیدگیوں کو اپنے ادراک اور عمل سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا جس کا اس کسان عورت نے مظاہرہ کیا تھا جس نے شکایت کی تھی کیونکہ اس کے شوہر نے اسے ایک ہفتہ تک مارا پیٹا نہیں تھا اس لیے اسے اب اس سے محبت نہ رہی تھی۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۷۱ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰) بایں ہمہ اس کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ (اور یہاں ہم صفحہ ۶۰-۶۱ کے نیچے حاشیے میں لکھے ہوئے تبصرے کی طرف رجوع کرتے ہیں) نہ صرف تمام جنسیت بلکہ لذت مقعد کو آدمی کے سیدھا کھڑا ہونے کا طریقہ اختیار کرنے اور نتیجتاً قوتِ شامہ میں تخفیف ہونے کی وجہ سے نیست و نابود ہونے اور عضوی بھول کا شکار ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت سے ہی جنسی عمل کو ایسی مخالفت سے وابستہ کر دیا گیا ہے جس کی مزید تشریح نہیں ہو سکتی جو مکمل آسودگی میں مشکلات پیدا کرتی ہے اور اسے جنسی مقاصد سے دور کر کے قوتِ جنسی کے ترفع اور ہٹاؤ کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ BLEULER نے (JAHRBUCH FUR PSYCHO ANALYTISCHEUND PSYCHO-PATHLYSCHE FORSCHUNGEN-BD. V., 1913) میں ایک مرتبہ جنسی زندگی کو مسترد کرتے ہوئے اس قسم کے بنیادی رجحان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تمام NEUROTICS اور دوسرے بھی (NITER WINES ET FAOCES NASCMURR) اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ اعضائے تناسل بھی قوتِ شامہ کو اتنا زیادہ بیدار کرتے ہیں کہ کئی لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور جو اُن کے فعل مجامعت کو بے لطف بنا دیتی ہے۔ اس لئے ہمیں تمدن کے ساتھ ساتھ جو جنسی فراموشی ملتی ہے۔ وہ اسی کی گہری ترین جڑیں۔ حیاتِ نو کا وہ عضوی تحفظ ہے جو ابتدائی قسم کی حیوانی زندگی کے خلاف طرزِ ایستادگی سے شروع ہوا۔ سائنسی تحقیقات کا نتیجہ جو حیرت انگیز صورت میں عام طور پر عوامی تعصب کے مطابق ہے۔ بایں ہمہ اس وقت یہ نتائج تصدیق شدہ امکانات کی حیثیت رکھتے ہیں جو سائنسی اعتبار سے ثابت نہیں ہوئے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ قوتِ شامہ اہمیت میں ناقابل تردید تحقیقات کے باوجود یورپ میں آج کل بھی ایسی نسلیں پائی جاتی ہیں، جو عضو تناسل سے پیدا شدہ تیز بدبوؤں کی جو ہمیں اتنی بری معلوم ہوتی ہیں، شہوت انگیز ہونے کی حیثیت سے۔ بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اور انہیں ترک نہیں کریں گے۔

موازنہ کے لئے کہاوتی معلومات کے متعلق آدن بلاج کا سوال نامہ جو UBER DEN GERUCHSSBINNIN DERVITA SEXUALIS کے نام سے فریڈرک ایس۔ کراس کی ANTHROPHYTEIA کے نام سے مختلف جلدوں میں چھپا دیکھئے۔

۵

تحقیقاتِ تجزیہ نفس سے معلوم ہوا ہے کہ جنسی زندگی کی ناکامیاں ہم ہیں ان لوگوں کے لیے جنھیں ہم NEUROTICS کے نام سے پکارتے ہیں، بدرجۂ تم ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی تسکین علامات کے قائم مقام پیدا کرنے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ جو بایں ہمہ یا تو بذات خود تکلیف دہ ہوتی ہیں یا ان کا باعث ہوتی ہیں ایسے شخص کے ماحول اور سماج کے لیے۔ موخر الذکر حقیقت کو تسلیم کرنا آسان ہے لیکن اول الذکر ہمارے لیے ایک مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن تمدن جنسی تسکین کے علاوہ کئی اور قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

ہم نے تہذیب کی ترقی میں مشکلات کا پیدا ہونا ارتقا سے وابستہ تمام مشکلات کا جزو گردانا ہے، کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق اس کی ابتدا انس قوت جنسی کی حالت سکون، پرانے مقام کو نئے کے حق میں ترک کرنے کے عدم

رجحان سے ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ تہذیب اور جنسیات کی ٹکر کی وجہ یہ ہے کہ جنسی محبت دو انسانوں کے درمیان ایک قسم کا ایسا تعلق ہے جس میں تیسرا فالتو اور پریشان کن ہی ہو سکتا ہے تو ایک ہی بات ہو گی، حالانکہ تہذیب انسانوں کی بڑی جماعتوں کے درمیان تعلقات پر مبنی ہوتی ہے۔ جب ایک جنسی تعلق بلندی پر ہوتا ہے تو آس پاس کی دنیا میں دلچسپی لینے کے لئے کوئی صورت نہیں رہتی عاشقوں کا جوڑا بذاتِ خود کافی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ انھیں خوش رہنے کے لئے اپنے پیدا شدہ بچے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کسی اور حالت میں "کام دیو" اپنی اصلیت کو بے نقاب نہیں کرتا جتنا کہ متعدد چیزوں میں سے ایک نئی پیدا کرنے کے مقصد کو لیکن جب وہ ایسے آدمیوں کے درمیان محبت کرنے کے مثالی ذریعے حاصل کر لیتا ہے تو آگے بڑھنے کی خواہش نہیں رکھتا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم بے شک یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ایک مہذب جماعت اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو گی جو جنسی مانگ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مطمئن ہوں گے اور کام اور مشترکہ مفاد کے ذریعہ باقی لوگوں سے منسلک ہوں گے اگر ایسا ہو تو تمدن کو جنسی قوت سے جبراً طاقت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن اس قسم کی دل پسند صورت نہ ہی تو موجود ہے اور نہ ہی کبھی دیکھی گئی ہے۔ دراصل تمدن اس کے محدود بندھن سے مطمئن نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کوشش کرتا ہے کہ جماعت کو ایک دوسرے سے جنسی رشتے سے بھی جکڑ دے۔ یہ ہر قسم کا طریقہ استعمال کرتا ہے اور ایسے طریقے کی طرف داری کرتا ہے جس سے لوگوں کے درمیان شدید ہم شکلی (IDENTIFCATION) پیدا ہو سکے۔ علاوہ ازیں یہ جماعتوں

کے ان افراد میں دوستی پیدا کر کے انہیں طاقت ور بنانے کے لئے رکے ہوئے مقصد کی جنسی قوت کے ذریعے بہت بڑی بھینٹ وصول کرتا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے زندگی پر پابندیاں عائد کرنا ناقابل گریز ہے۔ لیکن ہم اس ضرورت کو نہیں سمجھ سکتے جو تمدن کو اس راہ پر ڈالتی ہے اور جنسیت کے خلاف کرتی ہے۔ یہ کسی ایسے پریشان کن اثر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہوگا جس کا ہم اب تک کچھ پتہ نہیں لگا سکے۔

اس کا سراغ شاید ہمیں مہذب سماج کے نام نہاد کامل معیاروں میں سے ایک میں مل سکتا ہے وہ یوں: تم اپنے پڑوسی سے اس طرح محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے کرتے ہو۔ یہ شہرۂ آفاق ہے، بلاشک وشبہ عیسائیت سے زیادہ پرانا ہے۔ جسے اپنے سب سے زیادہ قابل فخر دعویٰ ہونے کی وجہ سے نشر کرتی پھرتی ہے۔ تاہم یہ قدیم ترین نہیں ہے۔ بایں ہمہ تاریخی زمانوں میں لوگوں کو اس کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ ہم اس کے متعلق ایک سادہ نظریہ پیش کریں گے جیسے ہمیں اس کا پہلی بار علم حاصل ہوا ہو۔ اس وقت ہم اپنی حیرت کو چھپا نہیں سکتے، جیسے یہ کوئی خلاف فطرت چیز ہو۔ ہمیں ایسا کیوں کرنا چاہیے؟ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ہم اس قسم کا کام کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہ کس طرح ممکن ہے؟ میری محبت مجھے اتنی قابل قدر چیز معلوم ہوتی ہے کہ مجھے اسے بلا سوچے سمجھے پھینکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مجھ پر ایسی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے مجھے قربانیاں دینی ہوں گی۔ اگر میں کسی سے محبت کرتا ہوں تو اسے کسی نہ کسی طرح اس کا مستحق ہونا چاہیے میں اس وقت اس بات کو نظر اندا

کر رہا ہوں کہ وہ میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا میرے نزدیک عبث شے ہونے کی اہمیت کا امکان نہیں ہوتا (جہاں مجھ پر میرے پڑوسی کو محبت کرنے کا حکم عائد ہوتا ہے ہمارے درمیان ان دو قسم کے تعلقات میں سے کسی کا سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ وہ اس کا مستحق ہوگا اگر وہ بہت سی باتوں میں مجھ سے اتنا مشابہ ہو کہ اس کے ذریعہ میں اپنے سے محبت کر سکوں، اس کا مستحق ہوگا اگر وہ مجھ سے اتنا زیادہ کامل ہو کہ میں اس میں اپنا آدرش پا سکوں۔ اگر وہ میرے دوست کا لڑکا ہو تو میں اس سے محبت کروں گا۔ کیونکہ اگر میرے دوست کو بدقسمتی سے کوئی دکھ پہنچے تو وہ میرا دکھ ہوگا جس میں مجھے شریک ہونا چاہیے۔ لیکن اگر وہ میرے نزدیک ایک اجنبی ہے اور باوصف ہونے کے باوجود میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا یا اس نے اس سے پہلے میری جذباتی زندگی میں کوئی اہمیت اختیار کر لی ہے تو میرے لئے اس سے محبت کرنا مشکل ہوگا۔ میرے لئے ایسا کرنا بھی غلط ہوگا کیونکہ وہ سب جو میرے ہیں میری محبت کو استحقاق سمجھتے ہیں۔ اگر میں کسی اجنبی کو ان کے یکساں سمجھوں تو ان سے بے انصافی کرنا ہوگا۔ اگر میں نے اس سے محبت کرنی ہے (اس ہمہ گیر جذبہ کے ساتھ) صرف اس لئے کہ وہ بھی اس کرۂ ارض کا مکین ہے۔ ایک کیڑے یا EARTHWOR | گھاس کے سانپ کی طرح تو پھر مجھے افسوس ہے کہ اس کے حصے میں محبت کی قلیل مقدار ہی آئے گی اور اس لئے معقول قوانین کے مطابق مجھے اتنا حصہ اپنے لئے رکھنے کا حق ہے جتنے کی وہ اجازت دیتا ہے۔ اس حکم کو اتنی سنجیدگی سے نافذ کرنے سے کیا فائدہ جس کے حق میں ہماری عقل نہ ہو۔

'SHARIB' COLLECTION
RUDAULI, Distt. Bara Banki

جب میں زیادہ غور کرتا ہوں تو مجھے مزید مشکلات دکھائی دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ اجنبی محبت کرنے کے قابل نہیں ہے، بلکہ اگر دیانت داری سے کام کیا جائے، تو میں یہ تسلیم کروں گا کہ میری دشمنی حتیٰ کہ نفرت کا حقدار ہے۔ اس کے دل میں میرے لئے محبت کی رمق تک نہیں ہے۔ وہ میرا تھوڑے سے تھوڑا خیال بھی نہیں کرتا۔ اگر اس کو مجھے نقصان پہنچانے سے فائدہ حاصل ہو تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ نہ ہی کبھی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھے گا کہ اسے جو فائدہ ہوگا اس کی اس نقصان سے کیا نسبت ہوگی جو وہ مجھے پہنچائے گا۔ علاوہ ازیں اُسے اُس سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اسے تو اس سے تھوڑا سا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے، میری بے عزتی کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جتنا زیادہ محفوظ پاتا ہے یا میں جتنا زیادہ بے کس ہوں مجھے اس سے اس قسم کے رویے کی توقع کا اتنا زیادہ یقین ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا سلوک مختلف ہو، اگر وہ میرا اچھا خیال کرے اور مجھے تنگ نہ کرے تو بھی مجھے بہر حال، متذکرہ حکم سے قطع نظر اس سے اس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اگر یہ پر آواز حکم یوں ہوتا "تم اپنے پڑوسی سے اس طرح محبت کرو جس طرح وہ تم سے کرتا ہے" تو مجھے کچھ اعتراض نہ ہوگا۔ پھر دوسرا حکم ایسا ہے جو مجھے زیادہ ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے اور مجھ میں زیادہ مخالفت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ "اپنے دشمنوں سے محبت کرو" بہر حال جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو اسے زیادہ کڑا حکم سمجھنا غلط پاتا ہوں۔ بنیاداً یہ ایک چیز ہے۔[۱]

---

[۱] ایک بڑے شاعر کو کم از کم دل لگی میں ایسے نفسیاتی حقائق کہنے کی اجازت ہوتی ہے جن کی بڑی بری طرح مذمت کی جاتی ہے۔ ہینے کہتا ہے: "میں طبعاً بڑا امن پسند ہوں۔ میری خواہشات ان چیزوں پر مشتمل ہیں۔ ایک چھائی ہوئی چھت لیکن اچھا بستر، اچھی خوراک، (باقی حاشیہ صفحہ ۷۷ پر)

میرے خیال میں اب مجھے ایک سنجیدہ آواز ملامت دلا کر یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے: اس لئے کہ تمہارا پڑوسی محبت کرنے کے قابل نہیں ہے، غالباً تم سے دشمنی رکھتا ہے اس لئے تمہیں اس سے اتنی ہی محبت کرنی چاہیے جتنی تم اپنے اپنے آپ سے کرتے ہو۔ اس کے بعد ہی اسے ایک بے ہودہ عقیدے (CREDOQUIA ABSURDUM) کی ایک مثال سمجھتا ہوں، یہاں بے شک اغلب ہے اگر میرے پڑوسی کو مجھ سے اسی طرح محبت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جتنا کہ وہ اپنے آپ سے کرتا ہے، تو وہ عین وہی جواب دے گا جو میں نے دیا ہے اور وہ مجھے اس بنا پر مسترد کر دے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ حقیقی وجوہ کی بنا پر نہیں کرے گا لیکن وہ بھی اس قسم کی توقع رکھے گا: تاہم انسان کے چال چلن میں اختلافات ہوتے ہیں جنھیں ہم اخلاقیات سے قطع نظر وہ بلا وجہ نہیں ہوتے، نیکی اور بدی میں شمار کرتے ہیں جب تک یہ ناقابل تردید تفاریق نیست و نابود نہیں کی جاتیں۔ بلند ترین اخلاقی معیاروں پر پورا اترنا تمدن کے مفاد کے خلاف جاتا ہے کیونکہ یہ بدکاری کو سیدھی ایڑ لگاتا ہے یہاں ہمیں مجبوراً فرانسیسی اسمبلی میں پیش آیا ہوا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) تازہ ترین دودھ اور مکھن، میری کھڑکی کے سامنے پھول، میرے دروازہ کے سامنے چند اونچے درخت اور اگر اچھا خدا مجھے پوری طرح خوش رکھنا چاہتا ہے تو وہ مجھے میرے چھ یا سات دشمنوں کو ان درختوں سے لٹکتا دیکھنے کا لطف عطا کرے گا، پھر میں نہایت گہرے جذباتی انداز میں انھیں زندگی میں نقصان پہنچانے کے لئے معاف کر دوں گا بے شک آدمی کو اپنے دشمنوں کو معاف کر دینا چاہیے لیکن انھیں سزائے موت ملنے سے پہلے نہیں۔

(HEINE, GEDAN P.EN AND EINFALLE)

وہاں سزائے موت کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی ایک رکن کی والہانہ تقریر کو جو اس نے سزا کے منسوخ کرنے کی تائید میں کی سراہا جا رہا تھا، تو پیچھے سے اچانک ایک آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی "اب قاتل کی باری آئی ہے" (ONE MESSIEURS LES ASSASSINS COMMENCEMENT)۔

ان تمام باتوں کے پیچھے تھوڑی بہت سچائی پائی جاتی ہے۔ جس سے لوگوں نے بڑی تیزی سے انکار کیا تھا۔ یہ ہے، کہ آدمی شریف، خلیق اور محبت کے خواہشمند نہیں ہوتے، وہ اس وقت ہی مدافعت کرتے ہیں جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے لیکن پرزور حملہ کرنے کی خواہش کو ان کی جبلت کا حصہ سمجھنا چاہیے، نتیجتاً ان کا پڑوسی ان کی نظر میں صرف ایک مددگار یا جنسی چیز کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ان کے جذبہ حملہ آوری کو پورا کرنے اور اس کی بلا معاوضہ کام کرنے کی اہلیت کا ناجائز استعمال کرنے کی ترغیب دلاتا ہے، اس کی رضامندی کے بغیر اسے جنسی طور پر استعمال کرتا ہے، اس کے مال و اسباب پر جبراً قبضہ کرتا ہے، اسے ذلیل کرتا ہے یا اسے دکھ پہنچاتا ہے، اذیت پہنچاتا ہے اور مار دیتا ہے۔ اپنی زندگی کے اور تواریخی حقائق کے مقابلہ میں انھیں جھٹلانے کا کس کو حوصلہ پڑ سکتا ہے، یہ حملہ آور ظلم عام طور پر برخیز ہونے کا منتظر رہتا ہے (کسی نہ کسی طرح پیدا ہونے کا بہانہ ڈھونڈنے کا منتظر رہتا ہے) ورنہ یہ کسی اور کام میں صرف ہوتا ہے، جس کا مقصد نرم ذریعے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ ان سازگار حالات میں جب یہ ذہنی طاقتیں جو عموماً انھیں روکے رکھتی ہیں، اپنا عمل بند کر دیتی ہیں۔ یہ بھی از خود اپنے آپ کو آشکار کر دیتا ہے اور آدمیوں کو وحشی جانوروں کے روپ میں ظاہر کرتا ہے اپنے کو چھوڑنے کا خیال آنا بھی انوکھی شے معلوم ہوتا ہے جو شخص ان مظالم کو جو ابتدائی بھرتوں میں HUNS یا چنگیز خان اور تمرلین کے ماتحت نام نہاد دلگنگول

قوموں نے ڈھائے۔ یروشلم کی لوٹ کھسوٹ میں پاکباز مجاہدوں نے کئے بلکہ گذشتہ جنگ عظیم کی ہولناکیاں بھی اس میں شامل ہیں یہ یاد کر کے تو ہمیں انسان کے متعلق اس نظریے کی صداقت کے سامنے نہایت عاجزی سے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔

حملہ آوری کی طرف یہ میلان جو ہم اپنے آپ میں دریافت کر سکتے ہیں اور دوسروں میں موجود ہونا مجازاً فرض کر سکتے ہیں۔ ایسا عنصر ہے۔ جو ہمارے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بگاڑ دیتا ہے اور تمدن کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ بلند مطالبات کرے۔ اس مخاصمت کی وجہ سے مہذب سماج کے شیرازہ بکھرنے کا بہیم خطرہ رہتا ہے۔ ان کا اپنے مشترکہ کام میں ذاتی مفاد انھیں اکٹھا رہنے میں مدد نہیں دے گا۔ جبلی جوش و خروش معقول خودغرضی سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ تمدن کو ہر انسان کی جبلی حملہ آوری میں رکاوٹیں پیدا کرنے اور اس کا انسداد کرنے کے لئے اور ان کے مظاہر کو روکنے کے لئے ذہن انسانی میں مدافعانہ ردعمل (REACTION FORMATON) قائم کرنے پڑتے ہیں۔ اس سے وہ ان طریقوں کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ جن کے ذریعہ انسان ہم شکل IDENTIFICATION بننے اور رُکے ہوئے مقصد کے ساتھ عشقیہ تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لئے جنسی زندگی پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ اور اس لئے اس کا اپنے پڑوسیوں سے اس طرح محبت کرنا جس طرح وہ اپنے آپ سے کرتا ہے، بلند بالا حکم جو حقیقتاً سچ ثابت کرتا ہے کہ کوئی اور چیز اصلی انسانی فطرت سے اتنی زیادہ ٹکر نہیں کھاتی جتنی کہ یہ۔ اس اعتبار سے تمدن کی تمام جد و جہد اور کوشش کے باوجود کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مجرموں کے خلاف تشدد استعمال کرنے کا

ذمہ ہے کہ تہذیب وحشیانہ بے رحمی کے پیداوار ظلم و تشدد کا تدارک کرنا چاہتی ہے لیکن قانون اتنا قابل نہیں کہ انسانی حملہ آوری کی زیادہ لطیف اور موقع شناس اشکال کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب ہمیں اپنے بھائی بندوں کے متعلق عہد جوانی کا بے بنیاد نظریہ ترک کرنا پڑتا ہے اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی بد خواہی کی وجہ سے ہمیں زندگی میں کتنے رنج و الم جھیلنے پڑتے ہیں باینہمہ تمدن کو انسانی معاملات میں تمام جھگڑوں اور مقابلوں کو دور کرنے کے لئے ملزم ٹھہرانا نا انصافی ہوگی۔ یہ باتیں بلا شک و شبہ ناقابل گریز ہیں لیکن مخالفت لازماً دشمنی نہیں ہوتی۔ صرف اس کے لئے جگہ نکالنے کے لئے اس کا غلط استعمال ہو سکتا ہے۔

کمیونسٹوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انھوں نے ہمیں اس شیطان کے پنجے سے آزاد کرانے کے لئے ایک راستہ نکال لیا ہے۔ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ انسان دلی طور سے نہایت اچھا دوست دار ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے لیکن انفرادی سرمایہ دارانہ نظام نے اس کی فطرت کو بگاڑ دیا ہے۔ شخصی جائداد پر قبضہ آدمی کو طاقتور بنا دیتا ہے، جس سے اس میں اپنے پڑوسیوں سے بدسلوکی کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ جس شخص کو جائداد کا مالک ہونے سے محروم کیا جاتا ہے وہ ظالم کے خلاف دشمنی میں آکر بغاوت کرتا ہے۔ اگر انفرادی جائداد کے نظام کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور بیشتر چیزوں کی مشترکہ ملکیت ہو جائے اور تمام لوگوں کو ان سے مستفیض ہونے میں یکساں حصہ دیا جائے تو آدمیوں میں بدخواہی اور دشمنی ختم ہو جائے گی کیونکہ تمام ضروریات پوری ہو جائیں گی، دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے

کی بنا دور ہو جائے گی۔ تمام بڑی خوشی سے ضروری کام کریں گے۔ مجھے اشتراکی نظام پر اقتصادی نکتہ چینی کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انفرادی ملکیت کی تنسیخ کی مناسبت کے متعلق آیا وہ فائدہ مند ہے یا نہیں میں تحقیق نہیں کر سکتا[1] لیکن میں یہ تسلیم کر سکتا ہوں کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک بے بنیاد فریب پر قائم ہے۔ ذاتی جائداد کو منسوخ کرنے سے آدمی حملہ آوری سے محبت کرنے کے ایک آلے سے محروم ہو جائے گا جو بلا شک و شبہ طاقتور ہے لیکن سب سے زیادہ نہیں۔ یہ کسی طرح بھی قوت واثر میں انفرادی اختلافات کو تبدیل نہیں کر سکتا جو جذبۂ حملہ آوری اٹھا اپنے فائدے کے لئے استعمال میں لے آتا ہے۔ نہ ہی یہ کسی طرح جبلی فعل کی نوعیت کو تبدیل کرتا ہے۔ یہ جبلت جائداد کی پیداوار نہیں ہے۔ زمانہ قدیم میں بھی، جب مقبوضات کم تھے، اس کا تقریباً دور دورہ تھا۔ یہ اپنے آپ کو طفل خانے ہی میں ظاہر کر دیتی ہے، جب مقبوضات نے ابھی اپنی اصل شکل بھی نہیں تبدیل کی ہوئی یہ انسان کے محبت وانس سے متعلقہ تمام رشتوں کی تہہ میں موجود ہوتی ہے ــــ ممکن ہے ماں کے بچے سے محبت کے واحد استثنا، کے علاوہ ــــ مثال کے طور پر اگر چیزوں پر ذاتی حقوق ختم کر دئے جائیں تو جنسی تعلقات مخصوص حقوق بن کر رہ جائیں گے، جو آدمیوں اور عورتوں کے درمیان،

---

[1] ہر وہ شخص جو اپنی جوانی میں مفلسی کی مصیبت میں مبتلا رہا ہے اور جس نے صاحب جائداد لوگوں کی بے اعتنائی اور تکبر کو برداشت کیا ہے ان شبہات سے آزاد کر دینا چاہیئے کہ وہ اقتصادی ناہمواری کے خلاف جنگ لڑتا اور اس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے کی سمجھ نہیں یا اس سے ہمدردی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اگر اس جنگ کو خدا کے نام پر سب لوگوں کے لئے مساوات حاصل کرنے کی مطالبہ کی کوشش کی شکل دی جائے تو یہاں ایک صاف سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدرت نے شروع ہی سے اس قسم کی ناانصافی کی ہے۔ وہ اپنے افراد کو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے یکساں پیدا نہیں کیا، جس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔

جو بصورت دیگر برابر ہیں۔ شدید ترین تلخی اور انتہائی تند دشمنی پیدا کردیں گے۔

فرض کرو اگر جنسی زندگی کو کھلی آزادی دیدی جائے حتیٰ کہ تمدن کے نطفے (GERM CELL) کنبے کا بھی خاتمہ ہو جائے، تو صحیح ہے کہ تب ہم ان نئے راستوں کا تصور نہیں کر سکیں گے جن پہ تمدنی ارتقا کو چلنے کا اختیار ہوگا لیکن ایک چیز کی آدمی ضرور انتظار کرے گا، اور وہ یہ ہے کہ وہ جہاں جائے گا انسانی فطرت کا اَن مٹ خاصہ اس کا تعاقب کرے گا۔ آدمی اپنے آپ ہیں۔ جو میلان حملہ آوری پاتا ہے اس کی تشفی نہ کرنا اس کے لیے ناقابل گریز ہے جب اسے اس کی تسکین سے محروم کیا جاتا ہے تو وہ بے چینی محسوس کرتا ہے۔ چھوٹے کنبوں کے موجود ہونے میں ایک فائدہ ہے جس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعہ حملہ آور جبلت خارجی گروہ کے ذریعہ تسکین حاصل کرسکتی ہے۔ ان آدمیوں کی کثیر تعداد کو متحد کرنا ہمیشہ ممکن ہوتا ہے جن کو ایک دوسرے سے محبت ہو، جب چند ایک ایسے پیچھے رہ گئے ہوں، جو حملہ آوری کے مظاہر کا شکار بن سکتے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ اس مسئلہ میں دلچسپی پیدا ہوگئی کہ وہ لوگ جن کی سرحدیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں اور ویسے بھی خاصا قریبی تعلق رکھتے ہیں وہ کیوں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ جیسے مثلاً اہلِ اسپین اور پرتگال، جنوبی اور شمالی جرمنی، انگریز اور اہل اسکاٹ لینڈ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان خفیف اختلافات کو خود پسندی (NARCICISM) کا نام دیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ حملہ آور رجحانات کے لئے آسان اور مقابلتہً بے ضرر طرز آسودگی ہے جس کے ذریعہ ایک گروہ کے اراکین کے درمیان زیادہ آسانی سے اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ یہودی لوگوں نے تمام اطراف

اکناف میں اتنے پھیلے ہوئے ہونے کے باوجود تمدنی ترقی کے لئے ان ملکوں میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی ہے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں لیکن عیسائی قرون وسطیٰ میں اپنے یہودیوں کا قتل عام کرلے کے باوجود اپنے ہم عصر عیسائیوں کے لئے امن اور سلامتی قائم نہ کر سکے۔ ایک بار نبی مسیح پال نے سب لوگوں کو ہمہ گیر محبت کرنے کی تلقین کی تھی جسے اس نے عیسائیت کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ یہ غیر عیسائیوں کے لئے انتہائی ناروا داری پر منتج ہوا۔ رومن قوم جس نے اپنی ریاست کی بنیاد محبت پر نہیں رکھی تھی۔ مذہبی معاملے میں ناروا داری کے عادی نہ تھے حالانکہ اس کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور ریاست کے تانے بانے میں یہ رویہ پایا جاتا تھا۔ جرمنی کا ساری دنیا پر چھا جانے کے خواب جس کے تحت یہودیوں کے خلاف ایک اضافی تحریک شروع کر دی محض ناقابل تشریح اتفاق پر مبنی نہ تھا اور یہ ایک قابل فہم بات ہے کہ روس میں ایک نئے قسم کا اشتراکی تمدن قائم کرنے کی کوشش کو سرمایہ دار جماعت کی ایذا رسانی سے نفسیاتی مدد ملتی ہے۔ بایں ہمہ آدمی یہ پوچھتا ہے کہ اشتراکی روس کے باشندے سرمایہ دار جماعت کو پوری طرح ختم کرنے کے بعد کیا کریں گے۔

اگر تہذیب کو اس قسم کی قربانیاں درکار ہیں، نہ صرف جنسی بلکہ انسان میں رجحانات حملہ آوری کی بھی، تو ہم بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں آدمی کا خوش رہنا کیونکر مشکل ہے۔ درحقیقت قدیم انسان اس لحاظ سے خوش حال تھا کہ وہ جبلتوں پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کسی مخصوص عرصہ

کے لئے خوشی منانے کے امکانات کم تھے۔ مہذب آدمی نے اپنی خوشی کے امکانات کا کچھ حصہ حفاظت سے بدل لیا ہے تاہم ہم یہ نہ بھولیں گے کہ قدیم کنبہ میں اس کا سردار ہی جبلی آزادی کا حقدار تھا۔ دوسرے لوگ غلامانہ قید میں رہتے تھے۔ اس اقلیت، میں جو تمدن کے فوائد سے بہرہ ور ہو سکتی تھی اور اس اکثریت، میں جو اس سے محروم کی جاتی ہے تضاد تمدن کے ابتدائی مرحلے میں انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ آج کل جس قسم کے جنگلی پائے جاتے ہیں ان کے متعلق محتاط تحقیقات کرنے پر پتہ چلا ہے کہ اس آزادی کی وجہ سے ان کی جبلی زندگی آزادی کے اعتبار سے قابل رشک نہیں۔ اس پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہیں لیکن یہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ جن کا مہذب انسان کو خیال رکھنا پڑتا ہے۔

ہم اس طرح صحیح انداز میں اپنی موجودہ تہذیب پر اس بناء پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ وہ ہمیں وہ ذرائع بہم نہیں پہنچاتی جو ہماری شادمانی کے لئے مطلوب ہیں۔ اور اس درجہ تک قابل گریز مصیبت کے لئے جو وہ ہمارے لئے پیدا کر دیتی ہے ـــــ بے لاگ تبصرے سے اس کی خامیوں کو بے نقاب کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے وقت ہم دراصل اپنے جائز حقوق استعمال کرتے ہیں، اور اس کے برعکس اپنے آپ کو تمدن کے دشمن ثابت نہیں کرتے۔ ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ شاید کبھی ایسا وقت آجائے جب تہذیب میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی جن کی بدولت وہ ہماری ضروریات کے مطابق زیادہ تسلی بخش ہو جائے گی اور پھر ان نقائص سے مبرا ہو جائے گی جن کے لئے ہم نے اس کی ملامت کی ہے لیکن شاید ہم اس نظریے کے بھی عادی ہو جائیں گے کہ تمدن میں بنیادی چند ایک ایسے

نقائص مضمر ہیں جن کو دور کرنے کی کوشش بے سود ثابت ہوگی۔ اپنی جبلتوں پر پابندیاں عائد کرنے کے فرائض کے علاوہ جو ہمیں اٹل معلوم ہوتی ہیں ہمیں ایک ایسی کیفیت کا فوری خطرہ ہے جسے ہم گروہوں کی LA MISERE PSYCHODGIQUE کہتے ہیں۔ یہ خطرہ اس جگہ سب سے زیادہ قریبی ہوتا ہے جہاں سماجی طاقتوں کا اتصال گروہ کے بیشتر افراد کے ایک دوسرے کے ہم شکل ہونے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت جب کہ مشہور و معروف ہستیاں اتنی اہمیت حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں، جو گروہ کے تشکیل میں آنے سے مل جانی چاہیے[ل]۔ امریکہ میں تہذیب کی موجودہ کیفیت ہمیں تہذیب کے ضرر رساں اثرات جن سے ہمیں خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، پر غور کرنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے لیکن میں امریکی تمدن پر تبصرہ کرنے کے شوق پر قابو پاتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ میں خود امریکی طریقے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔

[ل] موازنہ کے لئے دیکھئے GROUP PSYCHOLOGY AND THE ANALYSIS -OF THE EGO (1921 LONDON. HOGARTH PRESS, 1922)

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

٦

اپنی پہلی تحریروں میں مجھے کسی ایک میں اس بات کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا جتنا اب، کیونکہ میں جو کچھ بنا رہا ہوں وہ آپ سب جانتے ہیں کہ میں کاغذ اور سیاہی کو استعمال میں لا رہا ہوں اور ایک وقت آنے پر کمپوزیٹر اور پرنٹرز کو بھی زحمت دوں گا تاکہ ان چیزوں کی تشریح کر سکوں جو عیاں ہیں۔ اس وجہ سے اگر یہ معلوم ہو کہ ایک خاص اور حملہ آور جبلّت کو تسلیم کرنے سے تحلیل نفسی کے جبلتوں سے متعلق اصولوں کی لازماً ترمیم کرنی پڑے گی تو میں اس قسم کی رائے کو لبیک کہوں گا۔

ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ ایسا نہیں ہے کہ یہ ایک ایسے نتیجے پر زیادہ قریب سے غور و خوض کرنے کی بات ہے جس پر ہم پہنچ گئے تھے اور اس کے متعلق منطقی نتائج حاصل کر لئے تھے۔ تمام نظریۂ تحلیل نفسی نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے لیکن جبلتوں کے

متعلق نظریے نے اپنا راستہ بڑی مشکلات سے ٹٹول کر دریافت کیا ہے۔ بایں ہمہ جبلتوں کے باقی ماندہ نظریے کے لیے اتنی ضرورت ہے کہ اس کی جگہ شروع میں کوئی اور اختیار کرنا پڑا۔ میں نے آغاز میں قطعی شش و پنج کی وجہ سے اس کی ابتدا شاعر اور فلسفی شلر کے اس مقولے سے کی "بھوک اور محبت دنیا کی گردش کو قائم رکھتے ہیں"۔ بھوک ان جبلتوں کو ظاہر کرتی ہے جن سے انسان کی حفاظت مقصود ہوتی ہے۔ محبت کسی چیز کی تلاش کرتی ہے۔ اس کا وہ بڑا فعل جس کی قدرت مدد کرتی ہے نسل کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح انا کی جبلتوں اور خارجی دنیا سے متعلقہ جبلتوں میں پہلی بار تضاد پیدا ہوا۔ کیونکہ موخر الذکر جبلتوں کی طاقت اور بلاشرکت غیر کے لیے میں نے "جنسی قوت" کی اصطلاح اختراع کی۔ اس لیے انا کی جبلتوں کی طاقت اور خارجی چیزوں سے متعلق جبلتوں کے درمیان اجتماع ضدین پیدا ہو گیا جو خارجی چیزوں سے محبت کرنے۔ نہایت وسیع معنوں میں ۔ کی طرف رجوع ہو گیا۔ ان خارجی جبلتوں میں سے ایک "ایذا پسند" دوسرے سے اس لیے مختلف تھی کیونکہ اس کا مقصد محبت سے عاری تھا۔ علاوہ ازیں بہت سی باتوں میں یہ صاف طور پر انا کی جبلتوں سے مل گیا اور اس کی "قوت جنسی" سے معرا فوقیت کی جبلتوں کی یگانگت کو چھپایا نہ جا سکا۔ لیکن اس قسم کے دوغلہ پن کو دور کیا جا سکتا تھا اس کے باوجود ایذا پسندی زندگی سے متعلق تھی۔ ظالمانہ کھیل محبت کے کھیل کی جگہ لے لیتا ہے۔ نیوراسس تحفظ ذات اور قوت جنسی کے حقوق کے درمیان کش مکش ایسی کش مکش جس میں انا فتحیاب ہو لیکن ایک انتہائی مصائب اور اتراک پر مشتمل بڑی قیمت پر۔

ہر ماہر تجزیۂ نفس یہ تسلیم کرے گا کہ ان میں سے کوئی بیان ایسا معلوم نہیں ہوتا جس کی نادرستی کو مدت ہوئی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بایں ہمہ غلبہ آور سے مغلوب اور اور مادہ سے متعلق جبلتوں سے لے کر انا تک ہماری تخلیقات جوں جوں ترقی کرتی گئیں ان میں ترمیمیں کرنی پڑیں۔ اس ترقی کی ایک افضل بات نرگسیت (خود پسندی) کا نظریہ پیش کرنا تھا۔ یہ خیال کرنا کہ قوت جنسی انا پر فی نفسہ خصوصیت سے مرکوز (CATHE IS) ہو جاتی ہے کہ اس کی آماجگاہ انا تھی اور موخرالذکر کو کسی حد تک اس کا مستقل مقام صدر بن کر رہنا پڑتا ہے۔ خود پسندانہ قوت خارجی چیزوں کی طرف رخ کرتی ہے۔ یوں یہ خارجی قوتِ جنسی (OBJECT LIBIDO) بن جاتی ہے اور پھر اپنے آپ کو خود پسندانہ قوت جنسی میں تبدیل کر لیتی ہے، خود پسندی کے متعلق نظریہ نے پیراز صدمہ (TRNEUROSISAUMATIC) کو قابلِ غور بنا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تباہ کن رجحان جو بصورت دیگر غیر محسوس تھا صاف اور ٹھوس طور پر ظاہر ہو گیا۔ تجزیۂ نفس کے نقطۂ نگاہ سے موخرالذکر کو اس نظریہ کے ترک کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ نیوراسس (TRANSFERENCE NEUROSES) انا کی جنسیت سے محفوظ رہنے کی کوشش ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ نظریہ قوتِ جنسی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ کیونکہ انا کی جبلتیں قوتِ جنسی سے بھی متعلق ہوتی ہیں، کچھ عرصے کے لئے تو یہ اٹل معلوم ہوا کہ قوت جنسی کو عام طور پر جبلی قوت کے مترادف سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ سی۔ جے۔ یونگ نے اس سے پہلے نظریہ پیش کیا تھا اس کے باوجود مجھے دل ہی دل میں اس بات کا ایک قسم کا یقین تھا کہ تمام جبلتیں ایک قسم کی نہیں ہو سکتیں میں نے (BEYOND THE PLEASURE PRINCIPLE (1920) میں اگلا قدم اٹھایا جب میں مجبوری دہراؤ (REPETION COMPULSION) اور جبلی

زندگی کی رجعت پسندی سے پہلی بار متاثر ہوا۔ زندگی کی نمود اور اس کے ہم شکل مسائل حیات پر قیاس آرائیوں کی بنا پر ہم نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس جبلت کے علاوہ جو جاندار شے کو محفوظ رکھتی ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ بڑے واحد وجودات میں باندھ دیتی ہے[لہ] ایک اور اس کے خلاف ہوتی ہے، جو ان واحد وجودات کو جدا کرنا چاہتی ہے ان کی پہلی غیر پیچیدہ حالت کو بحال کرنا چاہتی ہے۔ بالفاظ دیگر جبلتِ فنا (DEATH INSTINCT) اور کام دیو (EROS) کے مظاہر حیات اور ان دونوں کے باہمی اشتراک اور رد عمل کے نتائج کے ذریعہ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ بایں ہمہ اس قسم کی مفروضہ جبلتِ فنا کے عمل کو ثابت کرنا آسان نہ تھا۔ کام دیو کے مظاہر تو نمایاں اور قابل شنید تھے، آدمی یہ بھی فرض کر سکتا ہے کہ جبلت عناصر کے انتشار کے لئے نہایت چپکے چپکے بروئے کار تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس کی موجودگی کا ثبوت نہیں تھا۔ یہ خیال کہ اس جبلت کا کچھ حصہ خارجی دنیا کی طرف مرجوع ہو جاتا تھا۔ ہمیں ایک قدم اور آگے لے گیا۔ اس طرح اس جبلت کو فی نفسہٖ کام دیو کے فائدے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا کیونکہ جسم اپنے آپ سے باہر کسی جاندار یا بے جان چیز کو اپنی بجائے تباہ کر دے گا۔ اس کے برعکس باہر کی طرف اس بہاؤ کے کسی طرح بند ہو جانے سے اس کا لازماً یہ نتیجہ ہوگا کہ خود خرابی (SELF DESTRUCTION) ہر صورت میں اندر ہی اندر شدید ہوتی جائے گی۔ اس مثال سے آدمی یہ قیاس لگا سکتا ہے کہ جبلتوں کی دو قسمیں شاذ ہی۔ شاید کبھی نہیں۔ نمودار ہوتی ہیں بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف اور مبدل نسبتوں میں ملتی رہتی ہیں حتیٰ کہ ہم انہیں پہچان نہیں سکتے۔ ایذا پسندی جس کے متعلق ہم

[لہ] کام دیو (EROS) کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کا رجحان اور جبلتوں کی عام رجعت پسندی میں تضاد یہاں پر نمایاں ہو جاتا ہے جو دیگر مسائل پر تحقیقات کا مقام آغاز ہے۔

یہ جانتے ہیں کہ وہ جنسیت کا ایک جبلی حصہ ہے۔ تہیج محبت سے غیر معمولی آمیزش ظاہر کرے گی تب اس کا مدمقابل اذیت پسندی، جنسیت اور اپنی ذات کے اندر تباہ کن عمل جس کے نتیجے کے طور پر، بصورت دیگر، غیر محسوس تباہ کن رجحان صاف اور ٹھوس صورت میں ظاہر ہوگا کے مابین اتحاد کے مترادف ہوگا، جبلت فنا یا جبلت تباہی کے فرض کر لینے نے عالم تجزیہ نفس میں مخالفت پیدا کر دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبت تمام خطرناک اور مخالف چیزوں کو اپنی بنیادی دو قطبی (BIPOLAR) نوعیت سے منسوب کرنے کا بہت بڑا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ نظریے جن کا میں نے یہاں خلاصہ دیا ہے، میں نے پہلے پہل عارضی طور پر پیش کیے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجھ پر اتنا تسلط جما لیا ہے کہ میں اب کسی اور طرح نہیں سوچ سکتا۔ میرے خیال میں بطور قیاس یہ ان سب سے زیادہ فائدہ مند ہیں جنھیں استعمال کرنا ممکن ہے۔ وہ ہمیں حقائق کو بھولنے یا مسخ کرنے کے بغیر سادہ بنا دینے کا ایک ایسا عمل بہم پہنچاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تباہ کن جبلت کو جو جنس آمیز ہوتی ہے اور ایذا رسانی میں خارجی اور ایذا کوشی میں داخلی دنیا کی طرف منعطف ہوتی ہے، ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ لیکن میں یہ بات مزید نہیں سمجھ سکا کہ ہم نے غیر جنسی حملہ آوری اور تباہی کی ہمہ گیری کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا اور اپنی نارمل زندگی میں اسے مناسب اہمیت کیوں نہ دی (یہ صحیح ہے کہ تباہ کن رجحان جسے اندر کی طرف موڑا جاتا ہے جب اسے شہوت کی چاشنی نہیں دی جاتی، عموماً ہمارے احساسات سے کنی کترا کر نکل جاتا ہے)۔ مجھے اپنا مدافعانہ نظریہ یاد ہے جب جبلت تباہی کے متعلق نظریہ تجزیہ نفسی میں پہلی بار پیش کیا گیا اور مجھے اس تک رسائی حاصل کرنے میں کتنی

دیر لگی۔ میں اس بات سے کم حیران ہوتا ہوں کہ اوروں نے بھی اس قسم کی ہچکچاہٹ ظاہر کی تھی اور اب بھی کرتے ہیں جن کو پریوں کی کہانیاں مرغوب ہیں وہ یہ بات کبھی پسند نہیں کرتے کہ لوگ انسانیت کی حملہ آوری، تباہی اور علاوہ ازیں ظلم کی طرف رجحان کی باتیں کریں کیونکہ خدا نے انھیں اپنی ایسی صورت عطا کی ہے اور اپنی ہی فضیلتیں اور کمالات۔ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اُسے ناقابلِ تردید بدی کر سکیں سائنس کے تمام دعووں کے باوجود اور انتہائی فضیلت کے آپس میں بُعد کو دور کرنے کے کام کے کٹھن ہونے کا احساس دلوایا جائے شیطان درحقیقت خدا کو بری الذمہ کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس سے اخراجِ جذبات کے لئے وہی تنظیمی کام لیا جا سکتا ہے جو یہودی آریوں کے آدرش پر چلنے والے دنیا میں کرتے ہیں لیکن اس طرح آدمی خدا کو شیطان کے موجود ہونے اور بدی کا مجسمہ ہونے کے لئے ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے۔ ان مشکلات کے پیشِ نظر ہر شخص کے لئے یہ درست ہوگا کہ وہ مناسب موقعوں پر انسان کی بلند و بالا فطرت کی تعظیم میں عاجزی سے کورنش بجائے۔ یہ طریقہ اسے ہمہ گیر محبت حاصل کرنے میں مدد دے گا اور اس کے باعث اس کے بہت سے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا[لہ]

[لہ] گوئٹے کے مفسٹوفلیز میں ہمیں اصول بدی کی جبلت تباہی سے غیر معمولی طور پر نمایاں مشابہت نظر آتی ہے:-

وہ سب ہستیاں جو موجود ہیں
اپنے انجام کی حقدار ہیں — مفقود الوجود

....

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۲ پر)

قوتِ جنسی کے نام کو پھر کام دیو کی طاقت کے مظاہر، جو جبلت فنا کی قوت سے مختلف نہیں، بنانے کے لئے دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ موخر الذکر کا پتہ لگانا ہمارے لئے سخت مشکل ہے اور بہت حد تک ہم اس کی کام دیو کے پس منظر میں موجودگی کے متعلق قیاس کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ ہمیں جب بھی اس کا کام دیو میں تحلیل ہونے کا سراغ نہیں ملتا یہ ہماری گرفت سے نکل جاتی ہے۔ ایذا رسانی جس میں یہ شہوانی مقصد کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتی ہے لیکن اس کے باوجود ساتھ ہی ساتھ جنسی تشنگی کو مکمل تسکین پہنچاتی ہے ہمیں اس کی نوعیت کا صاف پتہ چل جاتا ہے لیکن یہ جہاں کہیں جنسی مقصد سے عاری معلوم ہوتی ہے، اندھا دھند تباہ کن دیوانگی میں بھی، ہم اس حقیقت کو فروگذاشت نہیں کر سکتے کہ اس کی تسکین غیر معمولی خود پسندانہ لطف اندوزی سے حاصل ہوتی ہے۔ انا کی پرانی قادر مطلق ہونے کی خواہشات کی تکمیل سے جب جبلت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱) حتیٰ کہ وہ سب جسے تم گناہ سے منسوب کرتے ہو۔ تباہی
بدی بھی مختصراً یہ ثابت ہوتی ہے
میرا قدرتی جزو ہے

کیونکہ اس کا مخالف انسان بذات خود پاک اور اچھے کاموں پر مشتمل ہے نہیں لیتا ماسوائے اس قدرتی طاقت کے جو حیات، پیدائش اور تجدید یعنی کام دیو

پانی، ہوا اور ہزاروں جرثوموں نے
جیسا وہ زمین سے پھوٹتا ہے، اسے توڑ کر آزاد ہو جاتا ہے
خشک، تر، گرم، سرد — ایک پھیلاؤ
اگر میں نے آگ پر ایک چیز کی قسم نہ کھائی ہوتی۔
تو کوئی چیز مجھ سے دور نہ رہ سکتی۔

لہ ہمارے موجودہ نظریے کو تقریباً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ قوتِ جنسی ہر جبلی منظر میں شریک ہوتی ہے لیکن اس منظر میں ہر چیز قوتِ جنسی نہیں ہوتی۔

تباہی کو کم کر دیا جاتا ہے اور استعمال میں، جیسے وہ مقصد کے اعتبار سے مسدود ہو لایا جاتا ہے اور خارجی چیزوں کی طرف متعارف کیا جاتا ہے۔ پھر یہ انا کی ضروریات کو پورا کرنے اور قدرت پر فوقیت پانے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا وجود دراصل قیاس آرائیوں پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس پر اس قسم کے اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ علم کی روشنی میں تو ہمیں یہ باتیں ایسی ہی دکھائی دیتی ہیں۔ آئندہ تحقیقات اور غور و خوض بے شک نئی معلومات بہم پہنچائیں گے۔ جن سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو سکے گا۔

مندرجہ ذیل میں میں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حملہ آوری کی طرف رجحان انسان میں پیدائشی اور خود مختارانہ جبلی میلان ہے اور میں اب اس بیان کی طرف پھر متوجہ ہوتا ہوں کہ یہ تمدن کے راستے میں سب سے زیادہ طاقتور رکاوٹ ہے۔ اس بحث کے دوران میں ایک مقام ایسا بھی آیا جب یہ خیال ہمارے ذہن پر مسلط ہو گیا کہ تمدن کی انسانی زندگی سے وابستگی ایک عجیب قسم کا فعل ہے۔ ہم تو اس بات کا بھی اضافہ کریں گے کہ یہ عمل کام دیو کا معاون معلوم ہوتا ہے جس کا متصد فرداً فرداً آدمیوں کو، کنبوں، اور بعد ازاں قبیلوں میں، قوموں کو ایک عظیم واحد انسانیت کی صورت میں کھڑا کرنا ہے — ایسا کیوں کرنا پڑتا ہے، ہمیں معلوم نہیں یہ فقط کام دیو کا کرشمہ ہے۔ ان لوگوں کی کثیر تعداد کو ایک دوسرے کو کشش قوتِ جنسی کے ذریعہ جکڑا رہنا چاہیئے۔ محض ضرورت، مشترکہ کام سے پیدا شدہ فوائد، ان کو ایک جگہ باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔ ان میں قدرتی جبلی حملہ آوری، ہر ایک کی سب سے دشمنی

اور سب کی ایک ہے، تہذیب کے اس قسم کے دستورِ عمل کے منافی ہے یہ جبلت حملہ آوری، اس جبلتِ موت، انا کی پیداوار اور نمائندہ ہے۔ جسے ہم نے کام دیو کے ساتھ ساتھ دریافت کیا ہے، موخر الذکر کے دنیا پر تسلط میں اس کا بھی حصہ ہے، اور اب میرا یہ خیال ہے، تمدن کے ارتقار کا مفہوم معمہ دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے قانونِ حیات اور موت، زندگی کی جبلتوں اور تباہی کی جبلتوں میں کشمکش کو اس طرح پیش کرے جیسے وہ اصنافِ انسانی میں پائی جاتی ہے۔ دراصل ایسی کشمکش کا نام زندگی ہے۔ چنانچہ تہذیب کے ارتقار کو بھی نوع انسان کے زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کو کہتے ہیں۔ دراصل یہی TITANS کی وہ جنگ ہے جسے ہمارے آیا اور گورنیس آسمانی لوریاں دے کر ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لہ اور ہم علاوہ ازیں اس بات کا بھی اضافہ کر دیں کہ اس کی تشکیل لازماً کسی خاص واقعہ کے بعد ہوئی جس کا دریافت کرنا ابھی باقی ہے۔

ان جانوروں میں جو ہم سے مشابہ ہیں اس قسم کا تمدنی ارتقا کیوں نہیں پایا جاتا؛ افسوس ہے کہ ہمیں معلوم نہیں، اغلباً ان میں سے کچھ مکھیوں، کیڑوں، مکوڑوں کو ان ریاستی اداروں، تقسیم کار، افراد پر طرح طرح کی پابندیاں لگانا، جن کے لئے ہم ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں. ہزارہا صدیوں کی کوشش کے بعد حاصل ہوا یہ ہماری موجودہ کیفیت کا خاصہ ہے کہ ہم اپنے احساسات کے ذریعہ جان جاتے ہیں کہ ہم عالم حیوانات کے طبقے میں رہنا یا اس کے نمائندے کی حیثیت میں کوئی پارٹ ادا کرنا ناپسند کریں گے۔ حیوانوں کی دوسری اقسام کے بارے میں ممکن ہے کہ ماحول اور اس کے زیر اثر برسرپیکار جبلت کے درمیان ایک تعطل پیدا ہو گیا ہو، جس کی بنا پر عمل ارتقا رک گیا ہو۔ قدیم انسان میں قوت جنسی میں وقتی تیزی پیدا ہو جانے کی باعث جبلت تباہی کی طاقت میں شاید اضافہ ہو گیا ہو، ہمیں اس بارے میں بہت سے ایسے سوالات کرنے ہیں جن کا ہمارے پاس اب تک کوئی جواب نہیں۔

ہمارے لئے یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب کے پاس

کون سے ایسے وسائل ہیں جن سے وہ حملہ آوری کو روک سکتی ہے، جو اُن کی مخالفت کرتی ہے، اسے بے ضرر بنانے کے لئے اور شاید اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے۔ ان میں سے چند ایک اقدامات کا تو ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا ہے حالانکہ اس کا نہیں جو ان میں سے اہم ترین ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں انفرادی ارتقا سے ملتا ہے۔ اس میں کیا رونما ہوتا ہے جو اس کی حملہ آوری کو بے ضرر بنا دیتا ہے؟ ایک ایسی عجیب بات جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی پھر بھی بڑی چھوٹی معلوم ہوتی ہے حملہ آوری کا اندرونی انعطاف (INTROJECTION) کر دیا جاتا ہے۔ اسے اندر کی طرف موڑ دیا جاتا ہے (INTERNALISATION) دراصل یہ جہاں سے آتی ہے وہیں واپس لوٹا دی جاتی ہے یعنی اَنا کے خلاف اس کا رخ تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اَنا کا ایک حصہ بحیثیت فوق الانا دوسروں سے ممیز ہو جاتا ہے اور اب ضمیر کی صورت میں انا سے اتنی سختی کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے جتنی انا دوسروں سے کرنا پسند کرتا ہے۔ درست فوق الانا اور تابع انا کے تناؤ کو ہم احساسِ جرم کہتے ہیں۔ یہ احتیاج سزا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تہذیب اس لئے افراد میں حملہ آوری سے خوفناک محبت پر قابو پانے کے لئے اس کو کمزور اور غیر مسلح کر کے اس پر پہرہ لگا دیتی ہے اور جیسا کہ ایک مفتوح شہر میں فوج کا حفاظتی دستہ رکھا جاتا ہے، ذہن میں اس قسم کا ایک ادارہ قائم کر دیتی ہے۔

جہاں تک احساس جرم کی ابتدا کا تعلق ہے، نفسیاتی تجزیہ دال کا ماہر نفسیات سے مختلف نظریہ ہے۔ نفسیاتی تجزیہ دانوں کے لئے اس کی تشریح

کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اول جب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ فرد میں احساس گناہ کس طرح پیدا ہوتا ہے تو اسے ایک ناقابلِ تردید بات بتائی جاتی ہے۔ (پاکباز لوگ اسے گناہ گارتہ کہتے ہیں) جب لوگ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جسے وہ "بد" کہتے ہیں لیکن ہمیں پھر پتہ چلتا ہے کہ ایسا جواب کہاں تک بے سود ہے، غالباً کچھ تامل کے بعد آدمی یہ اور کہے گا کہ جس شخص نے درحقیقت کوئی برا کام نہیں کیا، بلکہ محض ایسا کرنے کی نیت سے باخبر ہو گیا ہے، وہ بھی اپنے آپ کو تقصیر وار گردان سکتا ہے اور پھر ہم یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اس حالت میں ارادے کو کیوں عمل کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بایں ہمہ دونوں حالتوں میں ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ بدی کو پہلے ہی قابلِ الزام تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک ایسی چیز جسے عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔ اس قسم کے فیصلے تک ہم کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ ہم نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی اصلی (جسے کہ آدمی قدرتی بھی کہہ سکتا ہے) اہلیت کے متعلق نظریے کو رد کر سکتے ہیں۔ بدی اکثر وہ چیز نہیں ہوتی جو انا کو نقصان پہنچاتی ہو یا خطرے میں ڈالتی ہو۔ اس کے برعکس ہر ایک ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جو اس کے لئے باعثِ مسرت ہو۔ بظاہر ایک خارجی اثر بروئے کار ہے۔ یہی اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ اچھا اور کیا ہوتا ہے کیونکہ انسان کے اپنے احساسات نے آدمیوں کو ایک ہی راستے پر نہیں لے جانا تھا۔ ان کا اس خارجی اثر کے قبول کرنے میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ اسے دریافت کرنا آسان کام ہے۔ اسے بیان کرنے کا بہترین طریقہ محبت کھونے کا خوف ہے۔ اگر آدمی ان لوگوں کی محبت کھو دے

جن کا وہ محتاج ہوتا ہے تو وہ ان کی انھیں بہت سے خطرات سے بچانے کی قوت سے بھی محروم ہو جائے گا، اور اسے سب سے زیادہ طاقتور شخص سزا دے کر اپنی برتری ظاہر کرے گا۔ اس لئے اول تو وہ بڑا ہوتا ہے جو کسی آدمی میں محبت کھونے کا خطرہ پیدا کرتا ہے۔ محبت کھو دینے کے اس خطرے سے آدمی کو اس لئے باز رہنا چاہیے۔ اس لئے خواہ آدمی نے کوئی بڑا کام کیا ہے یا صرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال خطرہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب حاکم کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ کہ موخر الذکر دونوں حالات میں ایک ہی قسم کا طرز عمل ہو گا۔

اس ذہنی کیفیت کو ہم "ضمیر بد" کہہ سکتے ہیں لیکن درحقیقت یہ اس قسم کے لقب کا مستحق نہیں، کیونکہ اس مقام پر جیسا ظاہر ہے، صرف محبت کھو دینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سماجی تفکر (SOCIAL ANXIETY)۔ ایک چھوٹے سے بچے میں تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا لیکن بہت سے بالغوں میں اس کی صورت صرف اس لئے بدلتی ہے کہ باپ یا دونوں ــــ والدین ــــ کی جگہ زیادہ بڑا گروہ لے لیتا ہے۔ نتیجتاً اس قسم کے لوگ کوئی ایسا بڑا کام کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں جن سے انھیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جس کی انھیں ضرورت ہو۔ انھیں فقط اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ کسی طاقت کو اس کا پتہ نہیں چلے گا، انھیں اس کی بنا پر سزا نہیں ملے گی۔ ان کا تفکر صرف پکڑے جانے کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ سماج کو اس قسم

---

[1] ہمیں یہاں روسو کا مشہور افسر یاد آجاتا ہے۔

کی ذہنی کیفیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

جونہی فوق الانا کی بالیدگی پر حاکم کو اپنا لیا (INTERNALISE) جاتا ہے ایک اہم تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ تب ضمیر کے مظاہر کو نئی سطح پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمیں اس سے پہلے اسے ضمیر اور احساس جرم کا نام نہیں دینا چاہیے[1] اس جگہ پکڑے جانے کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کے لئے کسی کام کرنے اور اس کی خواہش کرنے میں فرق بھی، کیونکہ فوق الانا سے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی، خیالات تک نہیں۔ یہ سچ ہے کہ صورت حال اب باعثِ فکر نہیں رہتی کیونکہ نئے حاکم فوق الانا کا، جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس انا سے برا سلوک کرنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا جس سے وہ جکڑا ہوتا ہے لیکن ان چیزوں کی ابتدائی استحقاق کے اثر کی وجہ سے، جو کچھ پیچھے رہ گیا ہے اور دوبارہ پیدا ہونے کے لئے مغلوب ہو گیا ہے، اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تاکہ مجموعی طور پر صورت حالات ویسے ہی دکھائی دیں جیسے وہ شروع میں تھے۔ فوق الانا گناہ گار انا کو پر از خوف احساسات کے ذریعے اذیت پہنچاتا ہے، اور ان مواقع کا منتظر رہتا ہے جب خارجی دنیا اسے سزا دے گی۔

ضمیر ترقی اس دوسری منزل پر ایک ایسی خاصیت ظاہر کرتا ہے جو پہلی میں

---

[1] ہر معقول آدمی یہ بات سمجھ جائے گا اور اسے پیش نظر رکھے گا کہ اس قسم کے بیانیہ جائزے میں وہ چیزیں، جو در اصل بتدریج تبدیلی سے ظہور پذیر ہوتی ہیں صاف طور پر الگ الگ ہو جاتی ہیں اور فوق الانا کا وجود بھی اس کا صرف ایک جزو نہیں ہوتا بلکہ اس کے احساسِ جرم کی اضافی طاقت اور دائرہ اثر بھی ضمیر اور احساس گناہ کے بارے میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ بہت سے لوگوں کے علم میں ہے اور علاوہ ازیں جو در اصل زیر بحث نہیں۔

موجود نہ تھی اور جس کی تشریح کرنا بہت آسان نہیں یعنی کہ ایک شخص جتنا زیادہ راست باز ہوگا اس کا ضمیر اتنا ہی زیادہ سخت اور آسکی ہوگا حتیٰ کہ آخر کار وہی لوگ جو پاک بازی کی انتہا کر دیتے ہیں گہرے ترین احساس گناہ کی وجہ سے اپنے آپ کی ملامت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اپنا کچھ صلہ موعود کھو دیتی ہے تابعدار اور منتقمی انا کو اپنے ناصح کا اعتماد اور بھروسہ حاصل نہیں اور جیسا ظاہر ہوتا ہے، یہ اسے حاصل کرنے کی رائیگاں کوشش کرتی ہے۔ مقابلتاً سخت اور حس ضمیر نیک آدمی ہونے کی علامت ہوتا ہے، خواہ اولیاء لوگ اعلانیہ اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے ہوں۔ وہ اس بات کے پیش نظر اتنے غلط نہیں ہوتے کہ وہ جبلی خواہشات کو پورا کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں متواتر محرومی کے باعث یہ زیادہ سے زیادہ تیز ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر انہیں چند ایک بار پورا لیا جائے تو وہ کم از کم کچھ عرصے کے لئے کم ہو جاتی ہیں علم الاخلاق جیسے مسائل سے بھرا پڑا ہے یہاں ان حقائق میں سے ایک درپیش ہے۔ وہ یہ کہ بدقسمتی[1] یعنی خارجی محرومی، فوق الانا پر مشتمل ضمیر کی طاقت کو کافی حد تک شدید بنا دیتی ہے۔ جب تک انسان کے حالات ٹھیک رہتے ہیں، اس کا ضمیر نرم رہتا ہے اور انا کو وہ جو چاہے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنی داخلی تحقیقات کرتا ہے، اپنے گناہ کو دریافت کرتا ہے ضمیر کے معیار کو بلند کرتا ہے، اپنے لئے پرہیز لازم قرار دیتا ہے اور اپنے آپ کو گناہوں کے ذریعہ سزائے دیتا ہے۔ سب لوگ اس طرح کرتے آئے ہیں اور اب بھی

---

[1] احساس اخلاق کا بدقسمتی کی وجہ سے بڑھنا مارک ٹوئین نے ایک چھوٹی سی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر)

ایسا کرتے ہیں لیکن اس کی ضمیر کی ابتدائی اور بچپن کی منزل کی روشنی میں آسانی سے تشریح کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں فوق الانا میں انعطاف اندرونی (INTROJECTION) کے بعد اسے ترک نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور موخرالذکر کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قسمت والدین کی بحیثیت وسیلہ ایک بدل ہوتی ہے۔ بدبختی کا یہ مطلب ہے کہ آدمی کو بلند ترین طاقت اب محبت نہیں کرتی اور جب اسے محبت کھو دینے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو آدمی ایک بار پھر والدین کے نمائندہ کے سامنے، جو اس فوق الانا کی صورت میں ہوتے ہیں دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ خوشی کے دنوں میں جس کی اس نے لاپرواہی کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات خاص طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ جب قسمت کو بڑے مذہبی رنگ میں "خدا کی مرضی" کے علاوہ کسی اور چیز کا مظہر نہیں سمجھا جاتا۔ یہودی لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا بیٹا سمجھتے تھے اور خداوند تعالے نے ان پر یکے بعد دیگرے قہر نازل کرنے کے باوجود ان کا یہ اعتقاد نہ ہل سکا، یا اس کی وجہ سے انہیں اس کی طاقت اور انصاف کے بارے میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا۔ اس کی بجائے وہ دنیا میں اپنے پیغمبر بھیجتے گئے تاکہ وہ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور اس احساس جرم میں سے انہوں نے مرشدانہ مذہب کے سخت احکام مرتب کئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) مزیدار کہانی سے ثابت کیا ہے THE FINSTMELON I EVERSFOLE جیسا کہ اتفاق کی بات ہے، یہ تربوز کچا تھا۔ میں نے مارک ٹوین کو اپنے لیکچروں میں خود یہ کہانی سناتے سنا ہے اس کا نام بتانے کے بعد وہ رک گیا اور اپنے آپ سے مشکوک انداز میں یہ پوچھنے لگا۔ "کیا یہ پہلی تھی؟" یہی تمام

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ وحشی کا رویہ کتنا مختلف ہوتا ہے۔ اگر اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو نہیں بلکہ اپنی مورتی (FETISH) کو مجرم ٹھہراتا ہے اور اپنے آپ کو سزا دینے کے بجائے وہ اس کو پیٹتا ہے (اس لئے ہمیں احساس جرم کے دو اسباب کا پتہ ہے۔ پہلا وہ جو حاکم کے خوف سے پیدا ہوتا ہے اور وہ جو بعد ازاں وہ جو فوق الانا کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اول الذکر ہمیں اپنی جبلی خواہشات کو پورا کرنے سے روکتا ہے۔ دوسرا اس سے بڑھ چڑھ کر سزا یابی کی کوشش کرتا ہے کیونکہ ممنوع خواہشات کی موجودگی کو فوق الانا سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ فوق الانا کی درشتی، ضمیر کی سختی کی کس طرح تشریح کی جاتی ہے یہ فقط خارجی طاقت جس کا وہ جانشین ہے اور جس کی اس نے کسی حد تک جگہ لی ہے کا حاصل ہوتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ جبلی تسکین احساس جرم سے منطبق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترک خواہشات دراصل خارجی طاقت کے خوف کا نتیجہ ہوتا ہے، آدمی ذرائع شادمانی کو اس لئے ترک کرتا ہے تا کہ اس کی محبت نہ کھو بیٹھے۔ اس کے بعد آدمی حاکم سے یوں الگ ہو جاتا ہے جیسے اس نے اس سے تعلقات منقطع کر لئے ہوں۔ اس کے بعد احساس گناہ ختم ہو جانا چاہیئے لیکن فوق الانا کے خوف کا مسئلہ مختلف ہے۔ صرف ترک تسکین کرنا ہی یہاں کافی نہیں ہوتا، کیونکہ خواہش جاری رہتی ہے اور اسے فوق الانا سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود احساسات گناہ پیدا ہوں گے اور یہ "منطقی" طور پر فوق الانا کے قائم کرنے کا بہت بڑا نقصان ہے، یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں ضمیر کی ساخت کا نتیجتاً ترک آئندہ کے لئے انسان کو بری الذمہ کر د

اخلاقی ضبط کرنے کے عوض محبت ملنے کا یقین نہیں دلوایا جا سکتا۔ خارجی رنج پیدا ہونے کا اندیشہ۔ محبت کھو دینا اور خارجی طاقت کا سزا دینا ایک دائمی داخلی مسرت اور احساسِ گناہ کے تناؤ سے بدل دیا گیا ہے۔

اس قسم کے باہمی تعلقات اتنے پرپیچ ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اتنے اہم کہ ان کے بار بار پیدا ہو جانے کے خطرہ کے باوجود میں ان پر کسی اور زاویہ نگاہ سے بحث کروں گا۔ پھر واقعہ نگاری کا تسلسل یوں ہوگا۔ اول۔ طاقت کے خوف سے ترک جبلت۔ جو بے شک محبت کھو دینے کے مترادف ہوتا ہے کیونکہ محبت تعزیری حملہ آوری سے بچانے کا کام دیتی ہے۔ بعد ازاں ایک داخلی حکومت کے خوف کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کے خوف سے ترک جبلت کا۔ یعنی ضمیر کا خوف۔ دوسرے بُرے کاموں اور بُرے ارادوں کا یکساں ہونا۔ اس لئے احساسِ جرم اور سزا یابی کی ضرورت کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ضمیر کی حملہ آوری حاکم کی حملہ آوری کی حامل بن جاتی ہے لیکن ہم اس ترتیب میں بدقسمتی (جبری ترک ہائے خارجی) سے پیدا شدہ نتائج کو کس طرح جگہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کا وہ سبب جس سے ضمیر کی درشتی غیر معمولی بڑھ جاتی ہے، بہترین قسم کے انسانوں میں، جو اس کے خلاف بغاوت کرنے کے قطعاً عادی نہیں ہوتے ضمیر کی سختی کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ ہم نے پہلے ضمیر کی یہ دونوں خصوصیات بیان کر دی ہیں لیکن اغلباً ہمارا اب تک یہی خیال ہے کہ یہ تفسیریں معاملے کی جڑ تک نہیں پہنچتیں اور یہ کوئی نہ کوئی نکتہ غیر واضح رہنے دیتی ہیں۔ یہاں آخر کار ایک خیال آتا ہے جو تجزیۂ نفس کا طرۂ امتیاز ہے اور عام طرزِ خیال کے لئے عجیب

ہے۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے کہ یہ معاملہ ہمیں کیوں کر لاینحل الجھا ہوا اور مبہم معلوم ہوتا تھا۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدا میں ضمیر (تفکر جو بعد ازاں ضمیر بن گیا، لہٰذا زیادہ صحیح ہوگا) ترک جبلت کی وجہ تھا لیکن بعد ازاں یہ رشتہ اُلٹ جاتا ہے۔ تب ترک ضمیر کا ایک محرک سرچشمہ بن جاتا ہے، تکمیل خواہشات سے ہر دست برداری اس کی سختی اور ناروا داری میں اضافہ کر دیتی ہے اور اگر ہم اسے صرف جو کچھ ارتقا ضمیر کے متعلق جانتے ہیں، کے مطابق ڈھال لیں تو شاید ہم میں اس قسم کے متضاد زاویہ نگاہ پیش کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے ضمیر خارجی ترک جبلت کا نتیجہ ہے یا ترک سے ضمیر پیدا ہوتا ہے۔ جو پھر مزید دست برداریوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس رائے اور ہماری ان معلومات میں ضمیر کے آغاز میں تضاد دراصل اتنا زیادہ نہیں ہوتا اور ہمیں ایک طریقہ دکھائی دیتا ہے جس سے وہ اور بھی کم ہو سکتا ہے۔ اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کرنے کے لیے ہمیں حملہ آور جبلت کی مثال مختصر کرنی ہوگی اور آئیے، ہم پھر یہ فرض کر لیں کہ زیر بحث ترک ہمیشہ ترکِ حملہ آوری ہوتا ہے۔ یہ بیشک محض ایک عارضی قیاس ہے۔ تو پھر ترک جبلت کا ضمیر پر مندرجہ ذیل انداز میں اثر ہوتا ہے حملہ کرنے کا ہر ہیجان جسے ہم بھول جاتے ہیں، فوق الانا اپنے ذمے لے لیتا ہے اور اپنی حملہ آوری (انا پر) بڑھا دیتا ہے۔ یہ بات یہاں اس لئے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ضمیر کی اصل حملہ آوری کو خارجی طاقت کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور اس لیے اس کا ترک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے لیکن ہم اس عدم مناسبت سے چھٹکارا پا سکتے ہیں، اگر ہم حملہ آوری کی مقدار کے منبع کو مختلف فرض کر لیں

جس سے فوق الانا کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب حاکم نے بچے کی اول اور اہم ترین خواہش کو پورا کرنے سے روکا تو ان جبلی محرومیوں کی نوعیت سے قطع نظر نہایت شدید قسم کے تہیجات پیدا ہو گئے ہوں گے۔ بچے نے لازماً ان انتقامی حملہ آور خواہشات کی تکمیل کو ترک کر دیا ہو گا۔ اس صورت حال میں جب تنظیمی اعتبار سے بڑا شدید دباؤ پڑتا ہے تو وہ عمل ہم تشکلی (IDENTIFICATION) اختیار کرتا ہے

عمل ہم تشکلی سے یہ اپنے آپ کو ناقابل مجروح حاکم میں مستغرق کر دیتا ہے۔ جو بعد ازاں فوق الانا بن جاتا ہے جس کے قبضے میں وہ تمام حملہ آور طاقت آ جاتی ہے۔ جو بچہ بخوشی اس کے خلاف استعمال کرتا ہے بچے کو حاکم کے ناخوشگوار پارٹ ادا کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے ــــ باپ ــــ جسے اس طرح بے عزت کر دیا گیا ہے، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے یہ اصلی حالت کا الٹا ہے ”اگر میں باپ ہوں اور تم میرے بیٹے، تو میں تم سے برا سلوک کروں گا۔ فوق الانا اور انا میں تعلق انا کے منقسم ہونے سے پہلے خارجی وجود سے تعلقات کی ایسی نقل ہوتی ہے جسے خواہش مسخ کر دیتی ہے۔ یہ بھی ایک خاص چیز ہے۔ بایں ہمہ حقیقی فرق یہ ہے کہ فوق الانا کی اصلی سختی ظاہر نہیں ہوتی ــــ یا اتنی زیادہ نہیں جتنی تجربے میں آئی ہوئی ہے یا جس کا ہمیں خارجی وجود سے اندیشہ ہوتا ہے بلکہ موخر الذکر کے خلاف بچے کے اپنے جذبات ظاہر کرتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو آدمی یقیناً کہہ سکتا ہے ضمیر شروع میں حملہ آور جذبے کے دباؤ سے پیدا ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے دباؤ پڑنے سے طاقت پکڑتا جاتا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا نظریہ صحیح ہے۔ پہلا جو ابتدائی اعتبار سے ناقابل تردید معلوم ہوتا تھا، یا دوسرا جو ہمارے نظریات کو اتنے خوش آئند انداز میں مکمل کر دیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں جائز ہیں۔ اور براہِ راست مشاہدات کی بنا پر بھی وہ ایک دوسرے سے متضاد نہیں ایک نقطے پر مل جاتے ہیں۔ کیونکہ بچے کی انتقامی حملہ آوری کا کچھ حصہ اس تعزیری حملہ آوری کا حصہ ہوتا ہے جس کی وہ اپنے والد سے توقع رکھتا ہے۔ تاہم تجربے نے بتایا ہے کہ بچے کے فوق الانا کی سختی اس سختی سے کسی صورت میں نہیں ملتی جو اس کے اپنے تجربے میں آتی ہے[1]۔ یہ موخر الذکر سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے۔ ایسے بچے کا ضمیر سخت ہو سکتا ہے جس کے ساتھ نرم سلوک ہوا ہے لیکن اس قسم کی خود مختاری کے متعلق مبالغہ کرنا بھی غلط ہو گا۔ کسی اسی بات کا یقین دلانا کہ سخت قسم کی پرورش کا بچے کے فوق الانا کی ساخت پر زبردست اثر پڑتا ہے مشکل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فوق الانا کی ساخت اور ضمیر کی بالیدگی کا فیصلہ کسی حد تک جسمانی عناصر اور کسی حد تک ماحول کے اثرات کرتے ہیں اور یہ بات کسی طرح بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ اس قسم کے تمام اعمال کی علتی شرط ہوتی ہے[2]۔

---

[1] جیسا کہ میلانی کلاین اور دیگر انگریز مصنفوں نے صحیح زور دیا ہے (PATHOGENIC L

[2] فرینڈ الیگزینڈر نے اپنی کتاب PSYCHOANALYSE DER SESAMTPERSON LITCHKEIT, 1927 - میں ایکورن کے ان میل بچوں کے مطالعہ چال چلن کے بارے میں تربیت دینے کے دو رنگی (HATLOGUNIC) طریقوں، ضرورت سے زیادہ سختی اور لاڈ پیار سے بگاڑنے پر بحث کی ہے۔ بیجا درجے کا نرم اور شفیق باپ فوق الانا کی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۷ پر)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب بچے کا بڑی جبلی محرومیوں کی طرف ردعمل انتہائی حملہ آور ہوتا ہے اور فوق الانا اتنا ہی سخت ہوتا ہے، اس سے بے خبر کہ حقیقت کے مطابق کون سا ردعمل جائز ہوگا، وہ نسلی ابتدا (PHYLOGENETIC) کے نمونے پر چلتا ہے۔ کیونکہ قدیم وقتوں میں باپ یقیناً خوفناک ہوا کرتا تھا اس لئے ہم بڑے وثوق سے انتہائی قسم کی حملہ آوری اس سے منسوب کر سکتے ہیں۔ یوں اگر فرد سے ہم نسلی ترقی کی طرف جائیں تو ارتقائے ضمیر کے نظریات میں اختلافات اور بھی کم ہو جاتے ہیں لیکن پھر اس کے برعکس ان دو اعمال میں ہمیں ایک نیا فرق معلوم ہوتا ہے۔ "ہم اس نتیجے کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ انسان کے احساس جرم کا سبب ایڈی پس کامپلکس (OEDIPUS CONPLEX) ہے اور یہ اس وقت پیدا ہوا جب بھائیوں نے مل کر باپ کو مار دیا۔ اس وقت حملہ آوری کو دبایا نہیں بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا گیا اور یہ وہ حملہ آور اقدام ہے جس کو بچے میں دبا کے جانے کو ہم احساس جرم کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اب مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی اگر کوئی قاری غصے میں آکر یہ چلا اٹھے کہ "اس لئے اس سے آدمی کے اپنے باپ کو مارنے یا نہ مارنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ بہرحال یہ احساس جرم پیدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) ضرورت سے زیادہ سخت ہونے کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ اس محبت کے مقابلے میں جو اس پر نچھاور کی جاتی ہے۔ بچے کے پاس اس حملہ آوری کو اندر ہی موڑنے کے سوا استعمال میں لانے کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔ ہر قسم کی محبت سے محروم ان بھولے ہوئے بچے میں بڑے ہونے پر فوق الانا اور انا میں باہمی تناؤ کم پایا جاتا ہے۔ ان کی حملہ آوری کا رخ باہر کی طرف تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس لئے کسی جسمانی عنصر کے علاوہ جو موجود ہو آدمی کہہ سکتا ہے کہ ایک سخت ضمیر دو عناصر کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جبلی تسکین سے وہ محرومی جو بچے کی حملہ آوری پیدا کرتی ہے اور اسے ملی ہوئی وہ محبت جو اس حملہ آوری کو اندر کی طرف موڑ دیتی ہے جہاں اسے فوق الانا اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔

ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں شکوک کو جگہ دینی چاہیئے۔ یا تو یہ درست نہیں کہ احساسِ جرم دبی ہوئی حملہ آوری سے پیدا ہوتا ہے، وگرنہ قتل کی تمام داستان رومان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور قدیم انسان کے اپنے باپ کو مارنے کی تعداد موجودہ تعداد سے زیادہ نہیں۔ علاوہ ازیں، اگر یہ رومان نہیں بلکہ بظاہر تاریخ کا ایک سچا واقعہ ہے تو یہ صرف اس کی ایک ایسی مثال ہے جس کے رونما ہونے کی ہم امید کرتے ہیں یعنی کہ آدمی کو تب احساس جرم ہوتا ہے، جب اس نے فی الحقیقت ایک ایسا کام کیا ہو جو سچا نہیں ثابت ہو سکتا۔ اور جس چیز کے ہم سب منتظر ہیں یہ ہے کہ تجزیہ نفس ہمیں اس قسم کے ردعمل کی تاویل پیش کرے۔ جو بہر حال ایک ایسی حقیقت ہے جو روزمرہ دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ درست ہے اور ہمیں اس فروگذاشت کی تلافی کرنی چاہیے لیکن اس میں کوئی خاص بھید نہیں ہے۔ جب کسی جرم کرنے کے بعد اور اس کی وجہ سے انسان میں بہت زیادہ احساس جرم پیدا ہوتا ہے تو اس احساس کو "ندامت" کہنا مناسب ہوگا۔ اس کا صرف ایک ہی فعل سے تعلق ہوتا ہے اور یہ صاف طور پر فرض کر لیتا ہے کہ "ضمیر" یعنی احساس جرم کی اہلیت فعل کرنے سے پہلے ہی موجود تھی۔ اس لئے اس قسم کی ندامت عام طور پر ضمیر کا سبب اور احساساتِ جرم کے معلوم کرنے میں مدد نہیں دے سکتی، روزمرہ کی ان مثالوں میں واقعات کی مندرجہ ذیل صورت ہوتی ہے۔ ایک جبلی ضرورت ضمیر کے باوجود پایہ تکمیل تک پہنچنے کی طاقت حاصل کر لیتی ہے جس کی قوت بھی محدود ہوتی ہے۔ نتیجتاً ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد اس کا کم ہونا قوتوں کے ابتدائی توازن کو بحال کر دیتا ہے

تجزیۂ نفس اس بحث سے احساسِ جرم کو خارج کرنے میں حق بجانب ہے خواہ وہ کتنی ہی بار کیوں نہ پیدا ہو اور عملاً اس کی اہمیت خواہ کتنی زیادہ نہ ہی ہو۔

لیکن اگر انسان کا احساسِ جرم باپ کے قتل تک پیچھے چلا جاتا ہے، وہ بے شک "ندامت" کی ایک مثال تھی اور کیا اس کے باوجود ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ اس موقع پر اس فعل سے پہلے ضمیر اور احساس جرم کا کوئی وجود نہیں تھا اگر یہ صحیح ہے تو احساسِ جرم کہاں سے آیا؟ اس مثال کے ذریعہ اس معمّہ کو حل ہو جانا چاہیئے تاکہ یہ ہماری مشکلات یوں ختم کر دے مجھے یقین ہے کہ یہ ایسا کرے گی یہ ندامت باپ کی طرف سے سب سے پہلے اور قدیم ترین دو رُخے (AMBIUALENT) جذبے کا نتیجہ تھی گو لڑکے باپ سے نفرت کرتے تھے لیکن اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان کے حملہ آور افعال سے ان کی نفرت کی آسودگی کے بعد ان کی محبت اس فعل پر ندامت کی صورت میں ظاہر ہوتی۔ انھوں نے باپ سے ہم شکلی کے ذریعہ فوق الانا قائم کیا، اسے تعزیری سزا دینے کی طاقت دی جو وہ انھیں اس حملہ آوری کے لیئے دیتا جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے، اور اس قسم کے فعل کا آیندہ کے لیئے انسداد کیا، اور کیونکہ والد پر حملہ آور ہونے کے تہیّجات اگلی نسل میں بھی دوبارہ پیدا ہوئے اس لیئے احساسات جرم بھی اس کے ساتھ باقی رہے، اور جب کبھی کسی حملہ آور اقدام کو زیر کر دیا جاتا اور اسے فوق الانا کو سونپ دیا جاتا تو یہ زیادہ طاقتور ہو جاتے۔ اس جگہ ہمارا خیال ہے، ہم آخر کار محبت کا وہ پارٹ دیکھ لیتے ہیں۔ جو اس نے ضمیر کی ابتدا اور احساس جرم کے مہلک ناقابل گزیر ہو جانے میں ادا کیا آیا کسی نے اپنے باپ کو واقعی قتل کیا ہے یا وہ اس فعل سے باز رہا، یہ بات اس کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔

بہر حال آدمی کو احساسِ جرم ہوتا ہے کیونکہ احساسِ جرم دو رُخے جذبے میں تصادم کا اظہار ہے، کام دیو اور جبلت تباہی یا جبلت فنا میں دائمی کشمکش۔ جونہی انسان کا انسانوں سے مل کر رہنے کا سوال پیدا ہوتا ہے یہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک اسے گھریلو زندگی کی اجتماعی صورت کے علاوہ زندگی کی دوسری صورت کا پتہ نہیں چلتا اُس کا ذریعہ اظہار ایڈی پس کامپلیکس ہوتا ہے، جو ضمیر کو ترقی دیتا ہے اور احساساتِ جرم پیدا کرتا ہے۔ جب بنی نوع انسان اجتماعی زندگی کو زیادہ بڑی صورتوں میں استوار کرنا چاہتی ہے تو اسی ٹکر کا پیدا ہونا جاری رہتا ہے —— ماضی سے ماخوذ اشکال میں —— اور شدید ہو جاتی ہے حتیٰ کہ احساسِ جرم کو تقویت پہنچ جاتی ہے کیونکہ تمدن ایک اندرونی شہوانی تہییج کا تابع ہوتا ہے، جو بنی نوع انسان کو مجمع کی صورت میں ایک دوسرے سے مضبوطی سے گانٹھ جوڑ دینا لازمی قرار دیتا ہے اور یہ اپنا مقصد لیے بہیم ترقی پذیر احساسِ جرم کو بیدار کرنے کے ذریعہ چوکس رہنے سے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ جو باپ کے رشتے سے شروع ہو کر جماعت کے رشتے پر ختم ہوتا ہے۔ اگر تہذیب کی مجموعی طور پر گروہ سے لے کر انسانیت تک کی لابدی بالیدگی اس کا رستہ ظاہر کرتی ہے جو احساسِ جرم کے شدید ہونے —— پیدائشی دو رخی جذبے کی ٹکر —— رجحانات محبت اور نفرت میں بہیم کشمکش کا نتیجہ ہیں —— کا اس سے چولی دامن کا ساتھ ہو گا۔ احساسِ جرم بڑھ کر شاید اتنا زیادہ ہو جائے کہ یہ افراد کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے یہاں ہمیں اس شاعر عظیم کا وہ موثر الزام یاد آجاتا ہے جو اس نے آسمانی طاقتوں کے خلاف لگایا تھا۔

تم نے ہی ہمارے قدم زندگی کی اس سڑک پر رکھے تھے
تم ہمارے مجرمانہ اور غلط اطوار کو دیکھتے ہو۔
اس لئے ہمیں چھوڑ دو۔ ہم اپنے بوجھ تلے دب گئے ہیں
زمین کے لئے اس کا ہر فرض نہایت بھاری ہے[1]

اور ہم اس بات پر شکرانے کا سانس لیتے ہیں کہ بہت کم آدمیوں کو یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کی محنت کے بغیر اپنے جذبات کے بھنور سے انتہائی قسم کی صداقتیں بچا سکیں۔ جہاں تک ہم جیسے لوگوں کو متواتر بھٹکنے کے بعد تکلیف دہ بے یقینی میں زبردستی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔

---

[1] WILHELM MEISTER THE SORG IF THE HARPER GOETHE

۸

اس قسم کے سفر کے خاتمے پہ پہنچ جانے پر جیسا یہ ہے، مصنف قارئین سے زیادہ ہنرمند نہ ہونے کے لئے معافی چاہتا ہے کیونکہ اس نے اس میں کئی دفعہ ملک کے ویران ٹکڑے اور دیگر اوقات کٹھن اُلٹے پلٹے راستے دکھانے میں دریغ نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام زیادہ خوش اسلوبی سے ہو سکتا تھا۔ میں اب کچھ نہ کچھ تلافی کرنے کی کوشش کروں گا۔

اول تو مجھے شک ہے کہ قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس مقالے میں احساسِ جرم پہ بحث مناسب حدود پار کر گئی ہے اور اس نے ضرورت سے زیادہ جگہ لے لی ہے جس نے بموجب نفسِ مضمون کے دوسرے حصے کو، جو ہمیشہ اس سے متعلق نہیں ہوتا، ایک طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے شاید اس مضمون کی ترتیب خراب ہو گئی ہو لیکن یہ احساس جرم کے ارتقائے تمدن میں اہم ترین مسئلہ ہونے

اور یہ بتانے کے لئے کہ تہذیب میں ترقی کی قیمت احساس جرم کو زیادہ کرنے کے ذریعے سے مسرت کا تاوان دے کر ادا کی جاتی ہے، کہ ارادے کو پوری طرح ظاہر کرنے کے مطابق ہے[۵] اس بیان میں، جو چیز پریشان کن معلوم ہوتی ہے، جو ہماری تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ غالباً احساس جرم کے مفہوم کا ہمارے شعور (CONSCIOUS سے رشتہ — جس کی اب تک مکمل طور پر تشریح نہیں کی گئی — ہے۔ ندامت کی تمام مثالوں میں جنھیں ہم نارمل سمجھتے ہیں، اس کا شعور کو صاف پتہ چل جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اسے "وقوف جرم" بھی کہتے ہیں۔ نیوراسس کی بحث میں، جس میں ہم کو نارمل لوگوں کو سمجھنے کے لئے کئی گراں قدر علامتیں ملی تھیں، ہمیں اس اعتبار سے کچھ متضاد کیفیات ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بیماری مجبوری دہراؤ (OBSESSIONAL NEUROSIS) میں احساس جرم اپنے آپ کو شعور میں اونچا سنواتا ہے

---

[۵] اور یوں ضمیر ہم سب کو بزدل بنا دیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج کل بچوں کی پرورش زندگی کا وہ حصہ ان سے چھپاتی ہے جو جنسیات اس میں لیتا ہے صرف ایک الزام نہیں جو ہم اس پر لگاتے ہیں کیونکہ یہ انھیں ان حملہ آوریوں کے لئے تیار نہیں کرتی جن کا شکار رہنا ان کے لئے یقینی ہے۔ بچے کو اس قسم کے غلط طریقے سے ڈھال کر اسے دنیا میں بھیج دینا تو ایسا ہے جیسا قطب کی مہم پر جانے والے لوگوں کو موسم گرما کے کپڑوں اور اٹلی کی جھیلوں کے نقشوں سے لیس کر دیا جائے۔ ہم صاف طور پر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اخلاقی معیاروں کو ایک لحاظ سے غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان معیاروں کے سخت ہونے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر تعلیم یہ کہہ دے کہ "آدمیوں کو یوں ہونا چاہیئے اگر وہ خوش ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کو ان سے ایسا نہ ہونے کو پیش نظر رکھنا چاہیئے"۔ اس کی بجائے بچوں کو اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ ہر شخص اس اخلاقی معیار پر پورا اترتا ہے، یعنی ہر دوسرا شخص نیک ہوتا ہے اور اس پر اس مطلبیے کی بنا رکھی جاتی ہے کہ بچے بھی نیک ہوں گے۔

یہ کیفیت مرض (CLINICAL PICTURE) اور مریض کی زندگی پر بھی چھائی ہوئی ہے اور اپنے قریب کسی چیز کو بمشکل رونما ہونے دیتی ہے۔ لیکن نیوراسس کی دوسری اقسام واشکال میں یہ بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا اثر کم نہیں ہوتا۔ جب ہم اپنے مریضوں سے لاشعوری جرم منسوب کرتے ہیں تو وہ ہم پر یقین نہیں کرتے، ان کے لئے معقول حد تک قابل فہم ہونے کے لئے انھیں سمجھانا پڑتا ہے کہ احساس جرم اپنے آپ کو غیر شعوری سزا جوئی کی صورت میں ظاہر کرتا ہے لیکن اس میں دماغی خلل (NEUROSIS) سے متعلقہ ہونے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ مجبوری دہراو کے مریضوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے احساس جرم سے بے خبر ہوتے ہیں یا اسے تکلیف دہ بے چینی، تفکر کی ایک قسم محسوس کرتے ہیں اور جب تک انھیں چند مخصوص حرکات کرنے سے روکا نہ جائے۔ ہمیں ایک دن ان مسائل کو سمجھنے کے قابل ہو جانا چاہیے، اب تک ہم جو نہیں کر سکے۔ شاید یہاں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ دراصل احساسِ جرم خد و خال سے متعلقہ قسم کا ایک تفکر ہے، جو مابعد کی منازل میں فوق الانا خوف سے مکمل طور سے منطبق ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تفکر کے وقوف سے تعلق کو وہی غیر معمولی تبدیلیاں مخصوص کرتی ہیں۔ تمام علامات کے پیچھے کہیں نہ کہیں تفکر چھپا ہوتا ہے۔ بہر حال بعض دفعہ یہ اپنے شور و غوغا میں ہر چیز کو غرق کرتا ہوا وقوف میں پہنچ جاتا ہے اور مابعد کی منازل میں یہ اپنے آپ کو اس قدر چھپا لیتا ہے کہ ہم مجبوراً لاشعوری تفکر یا اگر ہمیں نفسیاتی اعتبار سے پاک تر ضمیر مقصود ہو کیونکہ تفکر آخر کار ایک احساس ہی تو ہے، کا ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بہت ممکن ہے کہ تمدن سے پیدا شدہ احساس جرم کوئی تفکر پہچانا

نہیں جاتا اور وہ بہت حد تک لاشعور میں ہوتا ہے۔ یا کسی قسم کی بے چینی یا ہیجان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کے اندر کوئی محرکات تلاش کیے جاتے ہیں۔ بہرنوع مختلف مذاہب احساس جرم کے اس حصے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے جو انھوں نے تہذیب میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ وعدے کرتے ہیں، جس[1] پر میں نے کہیں اور بحث کی ہے کہ وہ انسانیت کو اس احساس جرم سے بچا سکتے ہیں جسے وہ احساس گناہ کہتے ہیں۔ ہم نے واقعی اپنے نتائج اخذ کر لیے ہیں، اس طریقے سے جس سے عیسائیت میں نجات حاصل ہوتی ہے ـــ ایک شخص کی قربانی کی موت جس سے وہ اجتماعی گناہ اپنے سر لے لیتا ہے ـــ اس موقع سے جب یہ احساس جرم پہلی بار پیدا ہوا یعنی وہ موقع جس سے تمدن کی ابتدا ہوئی۔

گو فوق الانا، ضمیر، احساس جرم، سزا کی ضرورت، ندامت جیسے الفاظ جنھیں ہم نے ایک دوسرے کی جگہ اور بہت آزادانہ طور پر استعمال کیا ہے، کے مفہوم کی تحقیق کرنا بہت ضروری نہیں لیکن یہ شاید جائز ہوگا ان سب کا ایک ہی حالت سے تعلق ہے لیکن یہ اس کے مختلف پہلو ظاہر کرتے ہیں۔ فوق الانا ذہن کا ایک ایسا آلۂ کار یا اس میں ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جس کی موجودگی استخراج پر مبنی ہے۔ ضمیر ایک ایسا فعل ہے، اوروں کے ساتھ جسے ہم فوق الانا سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ انا کی حرکات اور اس کی نیتوں پر چوکیداری کرنے اور ان پر محتسب کی حیثیت میں رائے دینے پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے احساس جرم، فوق الانا کی سختی ضمیر کے کڑے پن کے برابر چیزیں ہیں۔ یہ انا کا احساس ہے کہ وہ زیر نگرانی ہے۔ یہ انا کی ایسی جستجو اور فوق الانا

---

[1] میرا مطلب THE FUTURE OF A ILLUS. N ـــ سے

[2] TotMIND TABOO 191

کے اپنے معیاروں میں کشمکش کو جانتا ہے، اور وہ تفکر، جو ان تمام تعلقات کے پس منظر میں پنہاں ہے، اس حرف گیر ادارے کا خوف، سزا کی ضرورت، انا کا جبلی مظہر ہے۔ جو ایذارساں فوق الانا کے زیر اثر اذیت پسند ہو گیا ہے یعنی جو اپنی جگہ مصروف کار جبلت تباہی کے ایک حصے کی فوق الانا سے شہوانی وابستگی کو استعمال میں لے آیا ہے۔ ہمیں ضمیر کے متعلق تب تک بات نہیں کرنی چاہیئے۔ جب تک ہم فوق الانا کا وجود ثابت کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ جہاں تک احساس گناہ کا تعلق ہے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فوق الانا سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ضمیر سے پہلے۔ اس وقت یہ بیرونی طاقت کے خوف کا براہ راست اظہار رہتا ہے انا اور موخرالذکر میں تناؤ کی پہچان۔ یہ پدرانہ محبت کی ضرورت اور جبلی تشفی کے تقاضے کی ٹکر سے براہ راست ماخذ ہے۔ اور اس تقاضے کو روکنا ہی رجحان حملہ آوری پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ احساس جرم کی یہ دو مختلف تاویلیں ہیں۔ ایک بیرونی خوف سے پیدا شدہ اور دوسری اندرونی طاقت سے خوف زدہ۔ جنہیں ایک دوسرے پر اس طرح چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ ضمیر کے تعلقات کے متعلق ہماری بصیرت میں کئی قسم کی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ندامت ایک ایسی عام اصطلاح ہے جو انا کے احساس جرم کا خاص حالت میں ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ احساس جرم سے وابستہ جو حسی مواد موجود ہے اس میں شامل ہوتا ہے یہ بذات خود سزا ہے اور اس میں سزا کی ضرورت شامل ہو سکتی ہے اس لئے یہ بھی ضمیر کی بالیدگی سے پہلے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے لئے ایک بار پھر ان ضدین کا جائزہ لینا نقصان دہ

نہ ہوگا جنھوں نے ہماری تحقیقات کے دوران میں ہمیں کئی مرتبہ پریشان کیا ہے۔ ہم نے ایک جگہ کہا تھا کہ احساسِ جرم ناکردہ حملوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور دوسری جگہ، اور خاص طور سے تاریخی آغاز کے اعتبار سے، باپ کا قتل، یہ اس حملہ آوری کا نتیجہ ہوتا ہے جسے عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔ ہم نے اس مشکل کو حل کرنے کی ایک راہ نکالی تھی۔ اندرونی حکومت کی ترقی، فوق الانا، عین وہ چیز تھی جس نے تمام حالات کو بنیاداً تبدیل کردیا اس سے پہلے احساسِ جرم اس ندامت سے منطبق تھا۔ یہ کہنے سے ہمارا مطلب ہے کہ ندامت کی اصطلاح کو کسی اصلی حملہ آورانہ فعل کے ردعمل کے لئے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد فوق الانا کی ہمہ دانی نے حملہ آورانہ ارادوں اور حملہ آوریوں کے درمیان فرق کو ان کی اہمیت سے محروم کردیا۔ چنانچہ کسی جارحانہ اقدام اٹھانے کا ارادہ ہی احساس جرم پیدا کرسکتا ہے، جیسا کہ تجزیۂ نفس نے دریافت کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ بھی جو درحقیقت مرتکب ہوا ہے، جیسا کہ تمام دنیا جانتی ہے۔ دو قدیم جبلتوں کے دورخی جذبات کی باہمی ٹکر نفسیاتی صورت حال پر اسی طرح اثر انداز ہوتی ہے خواہ اس میں کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ پیدا ہوگئی ہو۔ یہاں جی چاہتا ہے کہ احساس جرم اور آگاہی کے مبدل تعلق کے راز کو کسی طرح افشا کیا جائے۔ وہ احساس جرم جو ہمیشہ کسی فعل پر ندامت، ظاہر کرنے سے لازما خبردار رہتا ہوگا، وہ جو کسی تہیج بد کے جاننے سے بے خبر رہا ہوگا لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہوسکتی مجبوری دہراؤ پُرزور انداز میں اس کی تردید کرتا ہے۔ دوسرا تضاد وہ حملہ آور طاقت تھی جو ہمارے خیال کے مطابق فوق الانا کو دی گئی تھی اور ذہن میں محفوظ تھی اور دوسرے نظریے کے مطابق اس کے برعکس، یہ حملہ آور طاقت اپنی ذات سے پیدا ہوتی ہی اپنے اقتناعی عمل کے

خلاف منعطف ہوتی ہے لیکن اسے عملی اخراج کی اجازت نہیں ہوتی۔ پہلا نظریہ احساسِ گناہ کی تاریخ کے زیادہ مطابق معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا اس کے اصولی نظریے کے مطابق۔ زیادہ گہرے غور نے اس ظاہری بے میل تضاد کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ ان میں جو کچھ مشترک اور ضروری رہ گیا تھا وہ یہ تھا کہ دونوں صورتوں میں ہمارا سروکار صرف اس حملہ آوری سے تھا جو اندر کی طرف منعطف کر دی گئی اس کے علاوہ کیفیتِ مریض واقعی ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اس قوتِ حملہ آوری کو، جو ہم فوق الانا سے منسوب کرتے ہیں، دو حصوں میں تقسیم کریں۔ جن میں سے ہر ایک کسی حالت میں زیادہ زور سے کارفرما ہو لیکن جو دونوں ایک ساتھ مصروفِ کار ہوتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس رائے پر نہایت سنجیدہ طور پر بحث کرنا چاہیئے جسے میں نے پہلے عارضی مفروضے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ جدید ترین تجزیۂ نفس[1] کا علم اس نظریے کی طرف رجحان ظاہر کرتا ہے کہ کسی قسم کی محرومی کوئی ناکام جبلی خواہش، احساسِ جرم کو شدید کر دیتی ہے یا ایسا کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آدمی اس طرح اس نظریہ کو نہایت آسان بنا سکتا ہے، اگر وہ اسے صرف حملہ آور جبلتوں کے متعلق ہی صحیح سمجھے اور یہ کہ اس مفروضے کی تردید کا کوئی جواز نہیں ملے گا۔ تو پھر حرکتی اور تنظیمی اعتبار سے اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ ناکام شہوانی خواہش کی جگہ شہوانی خواہش نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ یقیناً ٹیڑھے راستے

---

[1] خاص طور سے ارنیسٹ جونز، سوسن آئی زاکس، میلنی کلائن کی تصانیف میں۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم ہوا ہے ریک، اور الیگزینڈر کی تصانیف میں بھی۔

سے ہی نمودار ہو سکتا ہے۔ شہوانی خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ اس شخص کے خلاف حملہ آوری میں اتنا جوش پیدا کرتی ہے جس نے اس کی آسودگی میں مداخلت کی۔ اس لیے آخر کار حملہ آوری ہی دب جانے اور فوق الانا کے حوالے ہو جانے سے احساس جرم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ بہت سے اعمال کی تشریح کو زیادہ آسان اور واضح کرنے کی گنجائش ہے۔ اگر ہم تجزیۂ نفس کی احساس جرم سے لے کر حملہ آور جبلتوں تک کی معلومات کو محدود کر دیں، داستانِ مرض کی مدد کے بغیر ہمیں کوئی صاف جواب نہیں ملتا۔ کیونکہ ہمارے قیاس کے مطابق، دو قسم کی جبلتیں باہمی ملاوٹ کے بغیر شاذ ہی نمودار ہوتی ہیں لیکن انتہائی قسم کی مثالوں کی تحقیقات ہمیں اغلباً اس طرف لے جائے گی جس کی ہمیں توقع ہے۔ اس محدود نظریے کو عمل فروگذاشت (REPRESSION PROCESS) پر استعمال کر کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جیسا ہمیں معلوم ہوا ہے نیوراسس کی علامات دراصل غیر آسودہ جنسی خواہشات کی قائم مقام ہوتی ہیں۔ ہم تجزیۂ نفس کے دوران میں یہ معلوم کر کے حیران ہو گئے کہ شاید ہر نیوراسس کسی حد تک لاشعوری احساس جرم کو چھپانے کا کام دیتا ہے جو اپنی جگہ ان علامات کو بطور سزا غلط استعمال کر کے انھیں تقویت پہنچاتا ہے۔ اب آدمی ایک ممکن باضابطہ اصول کی صورت میں مندرجہ ذیل بیان تجویز کرنے کی طرف رغبت محسوس کرتا ہے۔ جب کوئی جبلی رجحان بھول کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے شہوانی عناصر اور حملہ آور اجزا، احساسِ جرم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بیان تقریباً صحیح ہونے تک درست ہو تو یہ ہماری دلچسپی کا مستحق ہے۔

اس مقالے کے کچھ قارئین شاید یہ خیال کرتے ہوں کہ کام دیوا اور جبلتِ موت

بین کش مکش کا فارمولا ضرورت سے زیادہ دہرایا گیا ہے۔ اس سے انسانیت میں اس تمدنی ارتقار کے پیدا ہونے کو مخصوص کرنا مقصود ہے لیکن اسے انفرادی بالیدگی سے بھی وابستہ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ عام طور پر خلقی زندگی (ORGANICLIFE) کے راز کو افشا کرنا بھی اس کا مقصد ہے۔ ہمارے لئے ان تین اعمال کے باہمی رشتے کو جانچنا لازم ہو جاتا ہے۔ اب اس فارمولے کے دہرانے کی صفائی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانیت اور فرد کی ترقی دونوں تمدنی ارتقار کے حیاتیاتی اعمال ہیں (LIFE PROCESSES) نتیجتاً یہ دونوں زندگی کی انتہائی ہمہ گیر خاصیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اس ہمہ گیر خاصیت کا ثبوت ہمیں اس وقت تک تفریق کرنے میں مدد نہیں دیتا جب تک اسے مزید ترمیموں سے محدود نہ کیا جائے اس لئے ہم ذہنی طور پر تب ہی مطمئن ہو سکتے ہیں جب ہم صرف یہ کہہ دیں کہ حیاتیاتی عمل وہ خاص بدلی ہوئی صورت ہے جو کام دیو کے زیر اثر پیدا ہوا جو اس کی منزل مقصود تھا اور جسے اینانکے (ANANKE)، خارجی احتیاج، نے فروغ دیا۔ اور یہ کام فرداً فرداً انسانوں کو قوتِ کشش کے ذریعے وسیع تر انداز میں متحد کرتا ہے۔ بایں ہمہ جب ہم انسانیت میں تمدنی ارتقا کا انسان کی انفرادی ترقی یا پرورش سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم بلا حیل و حجت یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ دونوں اعمال نوعیت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہیں۔ اگر فی الحقیقت ہیں تو اسی عمل کے مختلف وجودات پر استعمال کرنے سے۔ انسانی نسلوں میں مہذب بنانے کا یہ عمل قدرتی طور پر انفرادی ترقی کی بہ نسبت ایک غیر مرئی عمل ہے اس لئے اسے ٹھوس الفاظ میں سمجھنا مشکل ہے، نہ ہی اس قسم کی مشابہت کو انتہا تک پہنچانا چاہئے لیکن دونوں اعمال کے مقاصد کے ایک جیسا

ہونے کے پیش نظر۔ ایک میں ایک فرد کو ایک گروہ کے رکن کی حیثیت میں شامل کرنے میں اور دوسری جگہ بہت سے آدمیوں سے واحد گروہ پیدا کرنے سے۔ ان دونوں مقاصد کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کی مشابہت حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ان دونوں اعمال کے طرۂ امتیاز کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں اس پر بحث کرنا زیادہ دیر ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔ انفرادی بالیدگی قانونِ لذت پرستی کے لائحہ عمل کے مطابق معین ہوتی ہے، بالفاظ دیگر تحصیل خوشی اور اس مطمح نظر کو وہ کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ فرد کو جماعت میں شامل کرنے سے، یا اس کو اس کے مطابق ڈھال لینا، اب ایسی ناقابل گریز شرط معلوم ہوتی ہے جسے خوشی حاصل کرنے کے لئے پہلے پورا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اسے بغیر پورا کئے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا دے تو یہ شاید بہتر ہوگا۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے کہ انفرادی ارتقاء دو رجحانات کے باہمی اثرات سے پیدا ہوتا ہے ـــــ مسرت کوشی، جسے عام طور پر خود پسندی”؛ اور جماعت سے مل جانے کا ”مہیج“ کہتے ہیں، اور جسے ہم ایثار کہتے ہیں۔ ان دونوں تعریفوں میں سے کوئی بھی زیر سطح نہیں جاتی۔ انفرادی ارتقاء میں، جیسے ہم نے کہا ہے، اصلی زور تو خود پسندانہ رجحان پر دیا جاتا ہے، لذت کوشی پر، جب دوسرا جسے ”تمدنی“ کہا جاتا ہے، طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنے پر قناعت کرتا ہے لیکن تمدنی ارتقاء کے اعتبار سے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں سب سے مقدم مقصد آدمیوں اور عورتوں کو ایک جگہ متحد کرنا ہوتا ہے، اس دوران میں خوشی حاصل کرنے کے مقصد، حالانکہ وہ موجود ہوتا ہے، کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ تقریباً ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانیت کو انتہائی کامیابی سے ایک انبوہ عظیم کی صورت میں اکٹھا کیا جا سکتا

ہے بشرطیکہ انفرادی مسرت حاصل کرنے کی ضرورت کے متعلق کوئی تکلیف اٹھانی پڑے اس لیئے یہ ماننا پڑے گا کہ افراد کے عمل ارتقا کی چند نمایاں خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو انسانیت کے تمدنی ارتقا میں دوبارہ نہیں پیدا ہوتیں۔ پہلے دو اعمال صرف اس حد تک لازماً ایک دوسرے سے منطبق ہیں جہاں تک پہلے کو جماعت میں شامل کرنا مقصود ہے

جس طرح ایک سیارہ اپنے محور کے گرد گھومتے ہوئے اپنے دوسرے اجسام سماوی کے مرکزوں کا بھی چکر کاٹتا ہے۔ اسی طرح انفرادی طور پر انسان جوں جوں زندگی میں اپنے راستے پر چلتا جاتا ہے وہ انسانیت کے عمل ارتقا میں بھی حصہ لیتا ہے لیکن ہماری کم نظری کی وجہ سے ہمیں آسمانی طاقتوں کی حرکت دائمی طور پر غیر مبدل نظام کے مطابق معین معلوم ہوتی ہے، حالانکہ جاندار اشیا میں ہم اب بھی یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مختلف طاقتیں کس طرح ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتی ہیں اور ان تصادم کے نتائج روز بروز بدلتے رہتے ہیں۔ یوں ہر فرد میں دو رجحانات ایک ذاتی لذت کوشی کی طرف اور دوسرا ابقایا انسانیت سے اتحاد کی طرف کا ایک دوسرے سے لڑنا لازم ہے۔ یوں انفرادی اور تمدنی ارتقا کے دو اعمال کو ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور اپنے حق کے لیئے ایک دوسرے سے جھگڑنا چاہیئے۔ بایں ہمہ فرد اور سماج میں یہ کشمکش قدیم جبلتوں۔ کام دیوا اور موت۔ کی مخاصمت کی پیداوار ہیں، جو غالباً بے میل نہیں، یہ قوت جنسی کے فریق میں فی نفسہٖ نفاق کا غماز ہے جس کا مقابلہ انا اور اس سے متعلقہ چیزوں کے درمیان قوت جنسی میں شریک ہونے کا جھگڑا کہا جا سکتا ہے اور آخر کار اس کی انفرادی طور پر حل کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں امید ہے کہ تہذیب کے مستقبل میں بھی ایسی صورت پیدا ہو جائیگی۔ خواہ وہ اس وقت افراد پر کتنے ظلم

کیوں نہ ڈھائیں۔ تمدنی ارتقا اور انفرادی ترقی کے راستے میں مشابہت کو ایک لحاظ سے اور دور لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جماعت میں بھی فوق الانا پیدا ہو جاتا ہے، جس کے زیر اثر تمدنی ارتقا آگے بڑھتا ہے۔ انسان کے تمدنی نظام پر کسی ماہر کے لئے چند خاص مثالوں میں مشابہت کا مفصل مشاہدہ کرنا باعث کشش ثابت ہوگا۔ میں اپنے آپ کو چند نمایاں تفاصیل بنانے تک محدود رکھوں گا۔ کسی تہذیبی دور کا فوق الانا اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح فرد کا۔ یہ بڑی بڑی ہستیوں کے نقش پا پر مبنی ہوتا ہے، غیر معمولی ذہنی قوت رکھنے والے آدمی۔ وہ لوگ جن میں کوئی ایک رجحان غیر معمولی قوت اور صفائی سے ترقی پکڑ گیا ہے۔ اس کے بموجب وہ بے اندازہ ہوتا ہے۔ کئی جگہ یہ مشابہت بہت دور پہنچ جاتی ہے، کیونکہ ان کی زندگی میں بیشتر اوقات اگر ہمیشہ کے لئے نہیں ان آدمیوں کا دوسرے لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ ان سے برا سلوک کرتے ہیں اور انتہائی ظالمانہ طریقے سے انہیں مار بھی دیتے ہیں جیسا کہ قدیم باپ کے معاملے میں ہوا جو اپنی جبری موت کے کافی دیر بعد دیوتا بن کر پھر پیدا ہوا۔ اس قسم کی دوہری قسمت کی نمایاں مثال یسوع مسیح کی ہے، اگر یہ واقعی علم دیومالا سے تعلق نہیں رکھتی، جس نے ایسے قدیم واقعہ کو دھندلی یادداشت میں سے پیدا کیا۔ ایک اور نکتہ مشابہت یہ ہے کہ تمدنی فوق الانا، کسی فرد کے فوق الانا کی مانند، بلند آدرش اور معیار کام کرتا ہے اور جنھیں پانے میں ناکام رہنے کے باعث دونوں مع تفکرِ ضمیر کے ذریعے سزا دیتے ہیں۔ اس ضمن میں بے شک ہمیں ایک قابل غور واقعہ ملتا ہے۔ یہ کہ اس سے متعلقہ ذہنی اعمال سے ہم دراصل زیادہ واقف ہیں، اس صورت میں جب وہ فرد کی بجائے جماعت سے پیدا ہوتے ہیں اور شعور کے لئے زیادہ ممکن الوجو

ہوتے ہیں جب اول الذکر میں تناؤ پیدا ہوتا ہے تو فوق الانا کی حملہ آوری کے ملامت آمیز شور و غوغا سے سنائی دیتے ہیں۔ اس اثنا میں اس کے احکام اکثر پس منظر میں بے خبر رہتے ہیں، اگر ہم شعور کو اس سے آگاہ کر دیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مروجہ فوق الانا کے مطالبات سے منطبق ہوتے ہیں، اس جگہ دو اعمال اجتماعی ارتقا اور انفرادی بالیدگی ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنی مضبوطی سے ملے رہتے ہیں جیسے ان کو آپس میں سوراخ کر کے ٹھونک دیا گیا ہو۔ اس لئے فوق الانا کے بہت سے اثرات اور خصوصیات کا فرد کی بجائے جماعت میں حرکت میں آنے سے سراغ ملتا ہے۔

تمدنی فوق الانا نے اپنے آدرشوں میں توسیع کر دی ہے اور اپنے معیار قائم کر دیے ہیں، اگر وہ مطالبات جن کا انسان کے باہمی تعلقات سے واسطہ ہوتا ہے علم اخلاق کے نام سے مرتب کیا جاتا ہے۔ ہر دور میں اخلاقی نظاموں کی سب سے زیادہ قدر کی گئی ہے۔ جیسے آدمی کو ان سے خاص طور پر امید ہو کہ وہ بڑے نتائج پیدا کریں گے، اور علم الاخلاق کا بے شک بیشتر اس مسئلے سے بدرجہ اتم تعلق ہے جو کسی تہذیب کے کسی نظام میں سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ اس لئے اخلاق کو علاج کی ایک کوشش کہنا چاہیے۔ فوق الانا کے عائد کردہ معیاروں کے ذریعے ایک ایسی چیز حاصل کرنا جو تہذیب کے دوسرے ذرائع سے حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ ہم پہلے ہی جانتے ہیں۔ اسی پر ہم بحث کرتے آئے ہیں یہ سوال کہ آدمی کا ایک دوسرے پر حملہ آوری کرنے کے رجحان کا تہذیب کے رستے میں رکاوٹ بننے کو دور کیا جائے اور اسی وجہ سے اپنے پڑوسی کو اسی طرح محبت کی جائے جس طرح ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں۔ غالباً فوق الانا کا سب سے حالیہ مطالبہ ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ ہم ابھی

تحقیقات و نیوراسس کے ذریعۂ علاج میں انفرادی فوق الانا پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ جس کی دو وجوہ ہیں۔ اتنی سختی سے حکم دینے اور ممانعت کرنے سے یہ انا کی خوشی کا تھوڑا سا خیال بھی نہیں کرتا۔ اور یہ کہ اس پر عمل پیرا ہونے میں جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں ان کو پوری طرح پیش نظر نہیں رکھتا اور جبلی سرچشمہ (۹۱) میں تمناؤں کی قوت اور بیرونی ماحول کے مصائب کے مقابلہ کرنے کے ذریعۂ علاج میں اکثر فوق الانا سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور ان کے مطالبات کم کرنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تمدنی فوق الانا کے اخلاقی معیاروں کے خلاف اسی قسم کے اعتراضات کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی انسان کی ذہنی ساخت کے متعلق کچھ پروا نہیں کرتا۔ یہ ایک حکم تو ضرور دیتا ہے لیکن یہ نہیں پوچھتا کہ اس کی تعمیل ممکن ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس یہ فرض کر لیتا ہے کہ انا ما فوق الانا نفسیاتی اعتبار سے ہر مطالبہ کو پورا کروانے کا اہل ہے یعنی اس کے انا کو جبلی سرچشمہ پر لامحدود فوقیت حاصل ہے یہ غلط ہے۔ جن لوگوں کو ہم نارمل کہتے ہیں ان میں بھی جبلی سرچشمہ پر قابو پانے کی طاقت بڑی محدود ہوتی ہے۔ اگر آدمی ان سے اس نوعیت کا زیادہ مطالبہ کرے تو وہ ان لوگوں میں بغاوت یا نیوراسس پیدا کر دیتا ہے یا انہیں ناشاد کر دیتا ہے ہمارے لئے اپنے پڑوسیوں سے اسی طرح محبت کرنے کا حکم جس طرح ہم اپنے آپ سے کرتے ہیں، انسانی حملہ آوری سے سب سے مضبوط بچاؤ ہے اور یہ تمدنی فوق الانا کے غیر نفسیاتی انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس حکم کی تعمیل کرنا ناممکن ہے۔ محبت کا اس قدر تجاوز کر جانا اس کی قدر کو کم کر دیتا ہے اور موذی مرض کو دور نہیں کر سکتا تہذیب اس کی کلیتاً پروا نہیں کرتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اس تہذیب

کی موجودہ حالت میں اس قسم کی وعظ پرستی کرتا ہے لوگوں کے نزدیک گھاٹے میں رہتا ہے جنھوں نے اسے ناکام کر دیا۔ تہذیب کے رستے میں حملہ آوری کتنی زبردست رکاوٹ ہوتی اگر اس سے بچاؤ اتنی ہی مصیبت پیدا کر سکتا ہو جتنی وہ خود پیدا کر سکتی ہے، جسے ہم فطری اخلاق کہتے ہیں۔ وہ یہاں اپنے آپ کو خود پسندانہ طریقے سے اطمینان دلانے کے سوا کہ ہم دوسروں سے بہتر ہیں، اور کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ علم الاخلاق کی وہ صنف جو اپنے آپ کو مذہب سے منسلک کرتی ہے۔ اس جگہ آنے والی زندگی کے متعلق وعدے کرتی ہے۔ میری رائے میں تو جب تک نیکی کو اس زندگی میں صلہ نہیں مل جاتا۔ علم الاخلاق کی تلقین رایگاں جائے گی۔ مجھے اس بارے میں بھی کوئی شک نہیں کہ لوگوں کا جائداد کے متعلق نظریہ حقیقتاً بدلنا اس معاملے میں اخلاقی احکام سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اشتراکیوں کے نئے مطمح ہائے نظر پر مبنی امیدوں کے پیش نظر جو انسانی فطرت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جن کے باعث اس کی قدر عملی طور پر کم ہو جاتی ہے، اس منصوبے کو ناقابل فہم بنا دیا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ نظریہ جو تمدنی ارتقار کے مظاہر کو فوق الانا کی صورت گردانتا ہے اور بھی زیادہ معلومات بہم پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ میں جلد اس بحث کو ختم کرنے والا ہوں۔ بایں ہمہ ایک سوال ایسا ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر تہذیب کا ارتقار انفرادی بالیدگی سے اتنی گہری مشابہت رکھتا ہے اور اگر دونوں میں یکساں طریقے استعمال کیے جاتے ہیں تو کیا یہ تشخیص جائز نہ ہوگی کہ بہت سے نظام ہائے تہذیب — یا ان کے

ادوار — غالباً تمام انسانیت — کے مہذب کن رجحانات کے باعث نیوراٹک ہو گئے ہیں۔ ایسی نیوراٹک بیماریوں کے تحلیل نفسی کے ذریعہ تجزیہ کے لئے شاید ایسے علاج تجویز کئے جائیں جو کافی دلچسپ ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مہذب معاشرے کے لئے ایسا طریقہ استعمال کرنا فقط ایک خیال خام ہوگا یا اس کا بے کار ثابت ہونا امر یقینی ہے۔ لیکن ہمارے لئے احتیاط برتنا لازمی ہے، یہ نہ بھولتے ہوئے کہ آخر کار ہم تشبیہات ہی کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ کہ نہ صرف انسانوں بلکہ تصورات کو بھی اس جگہ سے باہر نکالنا جہاں ان کی ابتدا ہوئی اور وہ پروان چڑھے، خطرناک ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی نیوراسس کی تشخیص کو خاص تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ فرد واحد کے نیوراسس میں اس تضاد کو استعمال کر سکتے ہیں جن سے ہم مریض اور ماحول سے دوچار ہوتے ہیں جسے ہم نارمل گردانتے ہیں۔ اسے اس قسم کے کسی معاشرے میں ایسا پس منظر نہیں ملے گا۔ اسے کسی اور طریقے سے فراہم کرنا پڑے گا اور ہمارے علم کے طرز علاج کے استعمال کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ سماجی نیوراسس کا گہرا ترین تجزیہ بے سود ہوگا۔ کیونکہ کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ گروہ کو یہ علاج منتخب کرنے پر مجبور کر سکے۔

ان تمام مشکلات کے باوصف ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ ایک روز کوئی شخص مہذب طبقات کے امراض کی تحقیقات کرنے کا بیڑا اٹھائے گا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر انسان کے لئے تہذیب کی قدر کے متعلق رائے دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس پرجوش تعصب سے بچانے کی کوشش کی ہے، جو اس یقین پر مبنی ہے کہ ان تمام اشیا میں سے جو ہمارے

پاس ہیں، یا حاصل کر سکتے ہیں، ہماری تہذیب سب سے بیش بہا ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ ہمیں بعید از خواب کمال کی چوٹیوں تک لے جائے گا۔ میں بہرحال برا منائے بغیر ان نقادوں کی باتیں سنتا ہوں۔ جو اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جب ہم تہذیب کے مقاصد اور اس کے مستعمل طریقوں کا جائزہ لیتے ہیں تو آدمی ضرور یہ نتیجہ نکالے گا کہ یہ سب اتنی محنت کرنے کے قابل نہیں اور یہ کہ آخر میں یہ ایسی صورتِ حالات پیدا کرے گی جو کوئی شخص برداشت نہیں کر سکے گا۔ میرے لئے غیر جانبدار ہونا آسان تر ہے۔ کیونکہ مجھے صرف ایک چیز کا یقین ہے، اقدار کے بارے میں انسانیت نے جو رائیں دی ہیں ان کا فوری تعین ان کی خوش ہونے کی خواہشات ہی کر سکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ رائیں دلیل کے ذریعہ ان کے التباسات حقیقت کو سہارا دینے کی کوشش ہیں۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ اگر کوئی تمدنی ارتقا کے لابدی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مثال کے طور پر، یہ کہے کہ قدرتی انتخاب کو قربان کر کے انسان کی جنسی زندگی پر پابندیاں عائد کرنا اور انسان پرستی آدرشوں کو عملی جامہ پہنانا، ایک ایسا ارتقائی رجحان ہے جس سے گریز کرنا یا منہ موڑنا ناممکن ہے اور جنہیں ایسے قبول کر لینا جیسے وہ قدرتی ضروریات ہوں۔ میں یہ اعتراض بھی جانتا ہوں جو اس کے خلاف کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے رجحانات جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی طاقت ناقابل تسخیر ہے۔ انسان کی تاریخ میں اکثر ایک طرف پھینک دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے آ گئے ہیں اس لئے اپنے بھائی بندوں کے سامنے پیغمبر کی صورت میں رونما ہونے کا

تصور کر کے میری جرأت۔ جواب دیتی ہے اور میں اس ملامت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو میں ان کی تشفی کے لئے ان کی خدمت میں پیش کر سکوں کیونکہ دراصل لوگ یہی مطالبہ کرتے ہیں —— جنونی باغی اور نیک ایماندار، یکساں جوش سے۔

نسل انسانی کے متعلق مجھے یہ سوال فیصلہ کن معلوم ہوتا ہے کہ آیا اور کس حد تک اس کا ترقی یافتہ عمل اجتماعی زندگی میں حملہ آوری اور خود خرابی سے پیدا شدہ ابتری پر قابو پانے میں کامیاب ہوگا۔ اس ضمن میں شاید وہ مرحلہ جس میں سے ہم آج گذر رہے ہیں، خاص دلچسپی کا طالب ہے۔ آدمی قدرتی طاقتوں کو سر کرنے کے لئے اپنی قوتوں کو اس درجے تک لے گئے ہیں کہ ان کے استعمال کرنے سے اس وقت بآسانی اپنے آپ کو آخری آدمی تک نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ — اس لئے ان کی موجودہ بیشتر بے چینی، مایوسی اور خوفزدہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اب اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ ان دو آسمانی طاقتوں میں سے ایک، لافانی کام دیو اپنے آپ کو اپنے مقابلے کے لافانی دشمن کے شانہ بشانہ قدم رکھنے کے لئے اپنی طاقت استعمال کرے گا۔

نئی کتابیں

★ شکنتلا کالی داس
ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۲-۱۴-۰

★ پیام شباب قاضی نذرالاسلام
ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۲-۰-۰

★ عثمان بطور گوڈ فرلے لیاس
ترجمہ شاہد احمد دہلوی ۴-۸-۰

★ ابراہام لنکن اسٹرلنگ نارتھ
ترجمہ حامد حسین قادری ۳-۴-۰

★ سائنس ہمارے لئے ولیم کراؤز
ترجمہ میجر آفتاب حسن ۳-۸-۰

★ فلسفہ انقلاب کرنل جمال ناصر
مقدمہ و تذکرہ اسماء رشید ۳-۰-۰

★ جدید کمیونزم کا ارتقا میسیمو سلواڈوری
ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی ۲-۱۲-۰

★ کیسا باغ کیسی بہار میریا ین
ترجمہ جمیلہ ہاشمی، سعیدہ عروج، زیڈ۔ اے۔ برنی ۶-۸-۰

اردو اکیڈمی سندھ
رحمت بلڈنگ، نزد مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی